Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1960ء

آئین پاکستان کی تیسری شق

یہ ہونی چاہئے کہ

- ہر انسان، پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہوگا۔
- ہر ایک کو اسکی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ایک جیسے مواقع اور ذرائع میسر ہونگے۔
- تمام افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جائیگا۔
- اور ہر ایک کا درجہ اس کے ذاتی جوہر اور اعمال کے مطابق متعین ہوگا۔

We ask that the coming CONSTITUTION OF PAKISTAN shall ensure that every citizen is

(i) respected as a human being at par with others;

(ii) provided means and equal opportunity for the development of his inborn capabilities;

(iii) so deployed that his job is suited to his talents; and

(iv) accorded recognition by personal merit only.

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
ہند و پاکستان سے سالانہ:- آٹھ روپے
غیر ممالک سے:- ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان سے:-
بارہ آنے

ٹیلیفون:- ۷۵۰۰
— خط و کتابت کا پتہ —
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۳	اپریل سنہ ۱۹۶۰ء	نمبر ۴

— فہرست مضامین —

لمعات		۲
طاہرہ کے نام	(محترم پرویز صاحب)	۱۰
طلوعِ اسلام کنونشن	(صدر کنونشن کمیٹی)	۱۳
رابطۂ باہمی		۱۵
لغات القرآن	(محترم پرویز صاحب)	۱۷
سلیم کے نام	(محترم پرویز صاحب)	۴۵
سرسید احمد خاں	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۶۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تاریخ انسانیت کا پہلا ورق الٹیئے، آپ کو آدمی اور مذہب اکٹھے کھڑے دکھائی دیں گے۔ اس کے بعد آپ جس ملک پر نگاہ ڈالیں اور جس دور سے گذریں، مذہب اور آدمی ساتھ ساتھ چلتے نظر آئیں گے۔ آپ کو نہ کوئی ملک ایسا ملے گا جس میں مذہب کا چرچا نہ ہو اور نہ کوئی زمانہ ایسا نظر آئے گا جس میں انسان، مذہب کے بغیر رہ گیا ہو۔ مذہب کی نوعیت بدلی ہوگی۔ اس کی شکل و صورت میں فرق آگیا ہوگا۔ اس کے طور طریق مختلف ہو گئے ہوں گے۔ لیکن مذہب ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود ملیگا۔

مذہب اور انسان کا یہ ساتھ ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس دور میں آپ کو ہر طرف سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیں گی کہ مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے بعض ممالک ایسے ہیں جہاں مذہب کو بالکل تیاگ دیا گیا ہے بعض میں اس کا اثر بتدریج کم ہو رہا ہے اور مذہب پرست طبقے محسوس کر رہے ہیں کہ اب یہ کوئی دن کا مہمان ہے۔ حساس قلوب اس صورت حالات سے متوحش اور پریشان بھی ہو رہے ہیں اور اس پر سوچ بچار بھی کر رہے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، اور اس خطرہ سے محفوظ رہنے کی کوئی شکل بھی ہے یا نہیں؛ دیگر اہل مذاہب کو چھوڑیئے۔ خود مسلمانوں میں مذہب پرست طبقہ کی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی ہے کہ ہماری ابھرنے والی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہو رہی ہیں۔ ہمارے گھروں میں "دینداری" نہیں رہی۔ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ متنفر ہو رہا ہے۔ آپ کسی مذہبی اجتماع میں جایئے، آپ کو ہر جگہ یہ شور و شیون سنائی دے گا۔ واعظ، وعظ کہہ رہا ہو یا خطیب خطبہ دے رہا ہو، مولوی صاحب محفل نکاح میں ہوں یا مجلس تعزیت میں۔ ہر جگہ آپ کو یہی دکھائی دے گا کہ وہ غم و غصہ میں بھرے ہوئے نوجوان طبقہ پر بری طرح برس رہے ہیں۔ غصہ اتنا ہے کہ اپنے آپ پر ضبط نہیں ہو رہا ہے۔ طعن و تشنیع اور سب و شتم کا سیلاب ہے کہ امڈے چلا آرہا ہے اگر کسی کے پاس زبان کی جگہ قلم ہے تو جو انداز تقریر کا تھا، وہی تحریر کا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید۔ جب ان سے پوچھیے کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا مذہب کی طرف سے یہ تنفر کیوں ہے تو اس سوال کا ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ فرنگی تہذیب کا اثر ہے۔

مادہ پرستی کی فضا کے عام ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ اتنا کہہ کر یہ طبقہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہم نے مرض کی صحیح صحیح تشخیص کر لی ہے۔ حالانکہ اگر اس سلسلہ میں ایک قدم بھی آگے بڑھایا جائے تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آ جائے گی کہ جس چیز کا نام انھوں نے علتِ مرض رکھ لیا ہے وہ علامتِ مرض ہے۔ مرض کا سبب نہیں۔ یعنی اس مقام پر سوال یہ سامنے آئے گا کہ ہمارا نوجوان طبقہ تو اس لئے مذہب سے متنفر ہو گیا کہ اس پر مغربی تعلیم کا اثر ہے لیکن مغرب، مذہب سے اس قدر متنفر کیوں ہو گیا کہ وہاں دہریت اور مادہ پرستی زندگی کا معمول بن گئی؟ اس کا جواب یہ ملے گا کہ جو مذہب ان کے ہاں رائج تھا وہ تھا ہی ایسا کہ اس سے لوگ متنفر ہو جاتے! اس پر اگر کوئی شامت کا مارا یہ کہہ بیٹھے کہ حضرت! آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ ہمارے ہاں مذہب سے نفرت کی وجہ بھی یہی تو نہیں؟ تو اس کا جواب گالیوں کے سوا کچھ اور نہیں ملے گا۔

یہی وہ سوال ہے جس کے متعلق دعوتِ غور و فکر کے لئے ہم نے یہ طویل تمہید اٹھائی ہے۔ سوال بڑا اہم ہے اور اس قابل کہ اس پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر کیا جائے۔ اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ (جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے) ہم جب "مذہب" کا لفظ لکھتے ہیں یا بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد ہوتی ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب۔ اس کے برعکس، خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ضابطۂ حیات کا نام الدین ہے اور اسے ہم دین کہہ کر ہی پکارتے ہیں، مذہب کہہ کر نہیں۔ مذہب اور دین کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح، ہمارا مذہب پرست طبقہ بھی "مذہب" کا علمبردار ہے، دین کا نہیں۔ اس لئے ہماری یہ گفتگو بھی ان کی طرف سے پیش کردہ مذہب سے متعلق ہے، خدا کے عطا فرمودہ دین سے نہیں۔

مذہب کسی خاص دور کے انسانوں کے وضع کردہ نظریات و تصورات، رسومات و تقریبات اور قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ نظریات و قوانین اس وقت تک باقی رہ سکتے ہیں جب تک انسانی ذہن اسی سطح سے اونچا نہ ہو یا جب تک زمانے کے تقاضے نہ بدلیں۔ جب انسانی ذہن اس سطح سے بلند ہو جائے تو وہ ان تصورات پر کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا جو اس سے نچلی سطح کی پیداوار ہوں۔ اسی طرح جب کوئی قواعد و ضوابط زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دیں تو وہ کبھی آگے نہیں چل سکتے۔ بدلے ہوئے تقاضوں کے بعد ایک آدھ نسل تو سابقہ تصورات و ضوابط کو کسی نہ کسی طرح نباہتی ہے، کیونکہ مدت العمر تک ساتھ آنے والے تصورات کو جلد ہی چھوڑا نہیں جا سکتا۔ لیکن جب یہ تقاضے شدید ہو جائیں تو پھر کوئی طاقت انھیں ان کے ساتھ تمسک رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ہمارے زمانے میں، ایک تو (سائنٹیفک انکشافات و تحقیقات کی وجہ سے) انسانی ذہن کی سطح غیر معمولی رفتار سے بلند ہو گئی ہے۔ دوسرے (وسائل رسل و رسائل کے اس درجہ عام اور وسیع ہو جانے کے باعث) زمانے کے تقاضے بڑی سرعت سے بدلتے جا رہے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ ناممکن تھا کہ اس دور کا انسان ان تصورات پر مطمئن رہ سکتا جو اس کی ذہنی سطح سے کہیں پست تھے۔ یا ان قواعد و ضوابط پر کاربند رہتا جو اس کے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ اس زمانے میں مذہب کی گرفت اس قدر ڈھیلی پڑ چکی ہے اور انسان اسے رفتہ رفتہ چھوڑتا چلا جا رہا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ اس وقت مذہب کی گرفت صرف ان اقوام و ممالک میں ہے جہاں نہ علم کی روشنی عام ہوئی ہے اور نہ وہ دیگر اقوامِ عالم کے ہمدوش چل رہے ہیں اور

اصل تو یہ ہے کہ یہ گرفت بھی کوئی دن کی مہمان ہے۔ اب دنیا کی کوئی قوم اور کوئی ملک "تھرماس" (THERMOS) کے اندر رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ وہ باہر کی فضا سے، زود یا بدیر متاثر ہو کر رہتا ہے۔ اس لئے اب کسی ملک کے لئے یہ خیال کرنا کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے غیر متاثر رہے گا، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا اب اس دور کا آغاز ہو چکا ہے جس میں انسانوں کے خودساختہ مذاہب ایک ایک کر کے مٹتے چلے جائیں گے۔ یہ "برف کے بُت" سورج نکلنے کے بعد باقی رہ نہیں سکتے ــــ یہ تو خود ہے شبنم کو فنا کی تعلیم۔

مذہبی پیشوائیت اس صورتِ حالات سے بچنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ پنڈت ہو یا گیانی۔ پادری ہو یا مولوی، سب اس سے بچنے کے لئے اپنی اپنی جگہ بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ان کا یہ جذبہ بھی قابلِ فہم۔ ان کی روٹی اور اقتدار دونوں مذہب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ صدیوں سے اس "جاگیر" کے واحد مالک چلے آرہے ہیں۔ وہ کون ہے جو ایسی جاگیر کو آسانی سے چھوڑ سکتا ہے؟ لیکن ان کے اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے سے کیا ہوتا ہے؟ ان کے پاس تو صرف "روحانی قوت" ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شاہنشاہ، جن کے پاس اتنی اتنی بڑی افواجِ قاہرہ تھیں، وہ اپنے آپ کو زمانے کے تقاضوں سے نہ بچا سکے۔ آپ دیکھئے کہ کتنے "تاج" ہیں جو گذشتہ بیس پچیس سال میں فضا کی پہنائیوں میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمانے کے دھارے کے سامنے جب ان کی کوئی پیش نہ چلی تو "روحانی قوتیں" اس کا رخ کس طرح موڑ سکتی ہیں؟ آج دنیا میں "روحانی قوتوں" کا سب سے بڑا مظہر تبت کا لاما ہے جسے کروڑوں انسان خدا مانتے ہیں (اس کی روحانی سلطنت، روما کے پوپ سے بھی بڑی ہے۔ یا یوں کہئے کہ بڑی تھی)۔ اب یہی "خدا" اپنی جان بچانے کے لئے دربدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگائیے کہ جب اتنے بڑے بڑے "خداؤں" کی کس مپرسی کا یہ عالم ہے تو بے چارے "نائبینِ خدا" کو کون پوچھتا ہے؟

یہ ہیں وہ حالات جن میں انسانوں کا خودساختہ مذہب اب زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ مذہب کے محافظ ان حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ نہیں لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے سکیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اولاً یہ کہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہی نہیں۔ انھیں صدیوں سے یہ سکھایا جا رہا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں غور و فکر حرام ہے جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اسے عین حق و صداقت سمجھ کر، اسی طرح قائم رکھنا اور آگے بڑھا دینا سب سے بڑی خدمت ہے۔ انھیں پڑھایا یہ جاتا ہے کہ

کار چوبیں سخت بے تمکیں بود   پائے استدلالیاں چوبیں بود

دوسرے یہ کہ جب کسی کو نظر آرہا ہو کہ اس کی وہ متاعِ گراں بہا جس پر اس کی زندگی اور عیش سامانیوں کا مدار ہے، اس سے چھن رہی ہے، تو اس کا دماغ مختل ہو جاتا ہے۔ اس کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں (اسی کا نام غصہ ہے) جس سے اس کے رہے سہے حواس بھی گم ہو جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ اس بات کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا کہ جس چیز کو وہ دنیا کے سامنے عین حق و صداقت کہہ کر پیش کر رہا تھا، اس کے متعلق یہ اعتراف کرے کہ وہ بے بنیاد تھی اور زمانے کے تقاضوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ اس اعتراف کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہر مذہب کے پیشوا (اور ان کی دیکھا دیکھی ان کے متبعین) دوسرے مذاہب کے متعلق تو یہ

کہیں گے کہ وہ اس لئے مٹ رہے ہیں کہ ان میں زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اپنے مذہب کے متعلق کبھی یہ بات نہیں کہیں گے۔ اس کے متعلق وہ ہمیشہ "کفر و الحاد کی مخالفانہ کوششوں" کو موردِ الزام قرار دیں گے۔ لیکن ان کی اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے حقائق اپنا رخ نہیں بدل سکتے۔ حقائق کسی کی خاطر بھی اپنا رخ نہیں بدلا کرتے ـــــ سورج اپنے وقت پر طلوع ہو کر رہتا ہے خواہ اس کی روشنی چمگادڑوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے ـــــ مذہب ہمیشہ جہالت اور تاریکیوں میں پرورش پاتا اور اندھی تقلید کے سہارے آگے چلتا ہے۔ علم و بصیرت کی روشنی کے سامنے یہ ٹھہر نہیں سکتا۔ حقائق کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

لیکن جو اسباب اور حالات انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی موت کا باعث بنتے ہیں، وہی خدا کے عطا فرمودہ دین کی تقویت کا موجب ہوتے ہیں۔ علم و بصیرت کی روشنی مذہب کے لئے پیغامِ مرگ ہوتی ہے، لیکن دین اسی روشنی میں بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضے، مذہب کے لئے سیلاب بلا ہوتے ہیں لیکن دین، ان تقاضوں کی امامت کرتا ہے۔ اس لئے جو دور مذہب کے لئے ناساعد ہوتا ہے، وہ دین کے لئے بڑا ساز گار ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ مذہب کا کوچ، دین کی آمد کی علامت (اور تمہید) ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ " اِلَّا اللہ" سے پہلے " لَا اِلٰہ" ضروری ہے۔ یعنی جب تک انسانی ذہن کے تراشیدہ ہر تصور اور ہر صاحبِ اقتدار کو دل سے الگ نہ کیا جائے، خدا کا صحیح تصور اور دین، قلب کی گہرائیوں میں اتر نہیں سکتا۔ "الدین" کے راستے میں سب سے بڑی روک "مذہب" ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کی سرگزشت میں مذہب پرست طبقہ کی طرف سے مخالفت کا ذکر مسلسل کیا ہے۔ مذہب پرست طبقہ "الدین" کے قبول کرنے میں سب سے پیچھے رہتا ہے بلکہ بیشتر اس سے محروم ہی رہتا ہے۔ خود نبی اکرمؐ کی انقلابی دعوت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت "اہلِ کتاب" کی طرف سے ہوئی۔ عرب کے غیر اہلِ کتاب قبائل ابتدائی مخالفت کے بعد، رفتہ رفتہ اسلام لاتے چلے گئے۔ لیکن اہلِ کتاب کی مخالفت آخر تک رہی تا آنکہ انھیں (یہودیوں کو) ملک بدر کرنا پڑا۔ لہٰذا الدین کے تمکن کیلئے مذہب کا خاتمہ از بس ضروری ہے۔ اگر تمکن دین کے حامی اسے (مذہب) کو اپنی قوتِ بازو سے مٹا دیں تو دین کا تمکن جلدی عمل میں آجاتا ہے (جیسا کہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں ہوا)۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمانے کے تقاضے رفتہ رفتہ مذہب کو مٹا دیتے ہیں (جیسا کہ اب ہمارے زمانے میں ہو رہا ہے)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اگر ہمارے زمانے میں، دنیا میں مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے تو یہ چیز اہلِ مذہب کے لئے پریشانی اور سخت پریشانی کا موجب ہے (اور ہونی چاہیئے)، لیکن الدین کا تمکن چاہنے والوں کے لئے یہ بات باعثِ اطمینان اور وجہ مسرت ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی

وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ

یہ ڈوبتے تارے یہ فسردہ سا رخِ ماہ　　آثار بتاتے ہیں سحر ہونے کو ہے گی

لیکن مذہب اس تقدیر مبرم اور مرگِ مفاجات سے بچنے کے لئے جو عجیب و غریب حربے استعمال کرتا ہے ان میں سب سے بڑا اور پُر فریب

حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو "دین" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ دنیا میں کسی مذہب کے پیشوا یہ نہیں کہتے کہ ان کا مذہب انسانوں کا خود ساختہ ہے۔ ان کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ان کا مذہب خالص دینِ خداوندی ہے۔ وہ مذہب اور دین کو مرادف المعنی قرار دیتے ہیں سطح بین لوگ آسانی سے اس دھوکے میں آجاتے ہیں۔ خود پاکستان میں "اقامتِ دین" کے نام سے جو تحریکیں چلائی گئی ہیں وہ اس پُرکاری کی بین شہادت ہیں۔ ان سے مقصود خالصۃً مذہب کا تحفظ اور مفادِ پیشوائیت کا استحکام ہے لیکن انھیں پیش مذہب کے نام سے نہیں بلکہ دین کے نام سے کیا جاتا ہے۔ جھوٹ کا سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ کے نقاب میں سامنے آتا ہے۔ (اگر جھوٹا یہ کہدے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ سراسر جھوٹ ہے تو وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا) آجکل آپ نے دیکھا ہوگا کہ "مذہب" کی جگہ "دین" کا لفظ کتنی تیزی سے پھیلایا جا رہا ہے۔ اس سے یہی مقصود ہے۔ اس کے لئے یہاں سے وہاں تک بھاگ دوڑ کی جاتی ہے جگہ جگہ خطرے کی گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ مذہب کے تحفظ کے لئے منظم کوششیں کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان سب پر جن کا پیشہ مذہب ہے متحدہ محاذ بنانے کی اہمیت واضح کی جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ "مذہب کے استحکام" کے نام سے نہیں بلکہ "اقامتِ دین" کے نام سے کیا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ مذہب کا تحفظ بڑی نیک نیتی سے چاہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن کسی کا نیک نیت ہونا اس کے مسلک کی سچائی کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر کالی دیوی کا پجاری نہایت نیک نیتی سے دیوی کے بت کے تحفظ میں اپنی جان دیدے تو اس کا یہ عمل اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اس کا مسلکِ بت پرستی حق و صداقت پر مبنی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ دین نہیں مذہب ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن اس کا جواب بڑا آسان ہے۔ "الدین" قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور اس کے باہر جو کچھ ہے وہ مذہب ہے۔ جو بات قرآن کریم کی سند سے پیش کی جائے گی وہ الدین کی بات ہوگی۔ جو اس سند کے بغیر ہوگی، وہ مذہب سے متعلق ہوگی۔ دیگر اہلِ مذاہب کے پاس خدا کی کتاب (جو کبھی ان کے دین کی بنیاد بنی تھی) کہیں موجود نہیں۔ اس لئے ان کے ہاں مذہب اور دین میں امتیاز ہو نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی دشواری نہیں۔ یہ جو اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ صاحب! قرآن کی تعبیرات میں اختلاف ہے۔ وہ مجمل ہے، مُغلق ہے، مبہم ہے۔ یہ سب مذہب پرست طبقہ کے پیدا کردہ ہیں تاکہ لوگ دین کی طرف سے مایوس رہیں یا کم از کم پریشان ہو کر مذہب کے ساتھ چمٹے رہیں۔ لیکن یہ ان کی حرکتِ مذبوحی یا رقصِ بسمل ہے۔ اب اس قسم کی باتوں سے مذہب کا استحکام ممکن نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، مذہب زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹ رہا ہے۔ ان تقاضوں کے سیلاب کو خس و خاشاک کے بند سے نہیں روکا جا سکتا۔ مذہب کو مٹنا ہے۔ یہ مٹ کر رہے گا۔ اس لئے کہ ان الباطل کان زھوقا! اس کی تعمیر میں تخریب مضمر ہے۔

الدین کے تمکن کی آرزو دل میں رکھنے والوں کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہے۔ ان کے لئے یہ مرحلہ کڑے امتحان کا ہے۔ جو لوگ مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اگر ان کے سامنے خدا کا خالص دین پیش کر دیا جائے تو وہ مذہب کو چھوڑ کر الدین اختیار کرلیں گے۔ یہ انقلاب کتنی بڑی خوشگواریوں کا موجب ہوگا اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مذہب گزیدہ طبقہ ناقۂ بے زمام کی طرح آوارہ ہو جائے گا ـــــ اور آوارہ انسانیت جس قدر تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن سکتی ہے اس

کی تھوڑی سی جھلک گذشتہ دو عالمگیر لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہے اور اس کا مزید اندازہ، امریکہ، روس اور دیگر اقوامِ عالم کے عزائم سے لگ سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان "آوارہ انسانوں" نے بالآخر الدین کی طرف آنا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانیت کے لئے نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں۔ لیکن ان کے الدین تک آتے آتے، دنیا جن تباہیوں کی نذر ہو جائے گی اس کا تصور ہر دیدۂ عبرت کو خونفشاں بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

پاکستان میں مذہبی بیزاری کی رَو کس تیزی سے چل رہی ہے اور اس کی نمی کن گہرائیوں تک پہونچ رہی ہے، اس کا اندازہ ایک تازہ واقعہ سے لگائیے۔ عام طور پر کہا (اور سمجھا) یہ جاتا ہے کہ مذہب سے متنفر ہونے والا طبقہ، تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ واقعہ اس اندازہ کی تردید کرتا ہے اور اس حقیقت کا سراغ دیتا ہے کہ بات بہت دور تک پہنچ چکی ہے۔

چند دنوں کی بات ہے، ہمارے پاس گاؤں کا ایک معمولی زمیندار (کاشتکار) آیا۔ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن ذہن اس کا بڑا صاف تھا اور باتیں بڑی معقول کرتا تھا وہ بتا رہا تھا کہ گاؤں والے کس مصیبت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ اب سنتے ہیں کہ حکومت نے زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے بھی ایک الگ محکمہ قائم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے جو کچھ کہا وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم اسے کم و بیش اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اس نے کہا

"ہم غریب زمیندار سال بھر لہو پسینہ کر کے، زمین سے فصل پیدا کرتے ہیں وہ بھی اس صورت میں کہ موسم کی تباہ کاریاں یا سیلاب اسے برباد نہ کر دے۔ جو کچھ ہمیں ملتا ہے وہ بمشکل اتنا ہوتا ہے کہ ہمارا اور ہمارے بچوں کا سال بھر کا گذارہ ہو جائے۔ "گذارے" سے مراد دو وقت پیٹ کا ایندھن پورا کرنا ہے۔ جسے اتنا کچھ میسر آ جائے سمجھئے کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ اس پیداوار سے سب سے پہلے ہمیں حکومت کے واجبات ادا کرنے ہوتے ہیں۔ زمین کے متعلق سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ ہماری ملکیت ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ ملکیت حکومت کی ہوتی ہے۔ ہم اس کا لگان ادا کرتے ہیں۔ لگان کے علاوہ آبیانہ دینا پڑتا ہے جو اس پانی کی قیمت سمجھا جاتا ہے جس سے ہم اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، اور بھی ٹیکس ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً لگ جاتے ہیں۔ شہر والوں کو انکم ٹیکس دینا ہوتا ہے لیکن وہ صرف اس شخص پر لگتا ہے جس کی آمدنی دو تین سو روپے ماہوار سے اوپر ہو۔ لیکن ہمارے ہاں خواہ کسی کی آمدنی سو روپیہ سال کی بھی کیوں نہ ہو، اسے بھی لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو حکومت کا ٹیکس ہے۔ اس کے بعد مولوی صاحب آ جاتے ہیں کہ خدا کا ٹیکس دو۔ زکوٰۃ، فطرانہ وغیرہ خدائی ٹیکس ہیں۔ زکوٰۃ کے متعلق ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ پیداوار کا دسواں حصہ ہے۔ یعنی اگر کسی غریب نے سال بھر محنت کر کے، سو من غلہ پیدا کیا ہے تو اس میں سے دس من غلہ خدائی انکم ٹیکس میں دینا ہوگا۔ حکومت کا ٹیکس نہیں دیتے تو پولیس والے پکڑتے ہیں۔ خدائی ٹیکس نہیں دیتے تو مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی پولیس پکڑے گی پہلے قبر میں عذاب ہوگا۔ پھر جہنم میں جھونک دیئے جاؤ گے۔ حکومت کے متعلق تو پھر بھی اتنا ہے کہ وہ ہمیں زمین دیتی ہے اور اس کا کرایہ ہم سے لیتی ہے۔ پانی دیتی ہے اور اس کی قیمت لیتی ہے۔ معلوم نہیں، اللہ میاں ہم سے کس چیز کا ٹیکس لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تین تین چار چار برس ہو گئے ہیں کہ سیلاب سے فصلیں تباہ ہو رہی ہیں۔ ہمارے بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ ہمارے مال مویشی تباہ ہو گئے ہیں۔ سال میں تین تین چار چار ماہ

ہمیں نہروں کے بند پر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے کیونکہ گاؤں سیلاب کے پانی میں ڈوب چکا ہوتا ہے۔ وہاں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ وبائیں پھوٹتی ہیں۔ ہمارے بچے دھوپ میں جلتے ہیں۔ سردیوں میں ٹھٹھرتے ہیں۔ اللہ میاں اس وقت تو ہمیں کبھی زبانی دلاسا دینے کے لئے بھی نہیں آتے۔ لیکن اگر ہم مرتے بھرتے کچھ پیدا کر لیتے ہیں تو ان کے کارندے ٹیکس وصول کرنے کے لئے آ دھمکتے ہیں۔ یہ کچھ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ اگر آپ کچھ سمجھا سکتے ہوں تو سمجھائیے۔"

وہ غریب، سادہ، لیکن سینے میں حساس دل رکھنے والا دیہاتی یہ باتیں کر رہا تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب جب زمانے کے شدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا تو وہ کس طرح انسانوں کو (اور تو اور خود) خدا کے انکار تک لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "زکوٰۃ" کا یہ تصور خدا کے عطا فرمودہ دین کا نہیں، انسانوں کے خود ساختہ مذہب کا ہے۔ خدا کے دین میں، "قیصر" اور خدا کا ٹیکس الگ الگ نہیں ہوتا۔ پھر خدا کی حکومت میں تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہم نے جب اس دیہاتی بھائی کو یہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ صاحب! اگر کوئی اس بات کا ٹھیکہ لے لے کہ وہ ہماری اور ہمارے بچوں کی ضروریات پوری کرتا رہے گا تو ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ (دسواں حصہ تو ایک طرف) ساری کی ساری پیداوار اس کے حوالے کر دیں۔ ہم نے کہا کہ اس بات کا ٹھیکہ "خدا کی حکومت" لیتی ہے۔

کتنے میں اس کے جانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے ہماری بات اٹھتے اٹھتے سنی اور جاتے جاتے مسکراتے ہوئے کہا کہ "بہت اچھا۔ جب خدا کی ایسی حکومت قائم ہو جائے گی تو پھر ہم دل و جان سے اسے خدا مان لیں گے۔ لیکن آج تو......"

اس دیہاتی کی یہ باتیں انفرادی واقعہ نہیں۔ یہ ترجمانی کرتی ہیں اس کثیر طبقہ کی جو اس وقت مذہب سے برگشتہ ہو چکا ہے اور خدا سے بدگمان۔ ہمیں اس طبقہ کے نمائندوں سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا یہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان کے دل میں جتنے اعتراضات ابھرتے ہیں وہ ہمارے مروجہ مذہب کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور جب ہم ان کے سامنے قرآن کریم کا عطا فرمودہ دین پیش کرتے ہیں تو ان کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ آج تک ہمیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے اس مذہب گزیدہ طبقہ کے کسی فرد کے سامنے قرآن پیش کیا ہو اور وہ غیر مطمئن اٹھا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اطمینان صرف ذہنی ہو سکتا ہے۔ حقیقی اطمینان اسی صورت میں میسر آ سکتا ہے جب قرآن کا نظامِ حکومت عملاً متشکل ہو۔ ہمارا تجربہ ہمیں اس یقین تک پہنچاتا ہے کہ اگر پاکستان کا آئین قرآن کے مطابق مرتب ہو گیا اور اس طرح ہماری مملکت "حکومتِ خداوندی" کے خطوط پر استوار ہو گئی تو نہ صرف ہمارے ہاں دہریت اور کمیونزم کے آغوش میں جانے والا طبقہ، اسلام کا گرویدہ ہو جائے گا بلکہ ہم ساری دنیا میں دہریت اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں گے۔ اس لئے کہ باطل کی روک تھام دوسری قسم کا باطل نہیں کر سکتا۔ حق کر سکتا ہے اور حق صرف قرآنی نظام ہے مذہب نہیں۔

للہ الحمد ابھی ابھی اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا ہے کہ حکومت نے عائلی کمیشن (FAMILY LAWS COMMISSION)

کی سفارشات منظور کرلی ہیں۔ اگرچہ اس کمیشن کی تمام سفارشات سو فیصد قرآن کے مطابق نہیں تھیں لیکن، بایں ہمہ وہ موجودہ "قوانین شریعت" کے مقابلہ میں قرآن سے قریب تر تھیں۔ اس لئے حکومت کی طرف سے ان کی منظوری، ملک میں قرآنی قوانین کے نفاذ کی طرف قدم بڑھانے کے مرادف ہے۔ کمیشن میں ایک ہی مولوی صاحب (احتشام الحق صاحب) ممبر تھے اور انھوں نے ان سفارشات کے خلاف، اصل رپورٹ سے بھی طویل مخالفانہ نوٹ لکھا تھا۔ ہم ارباب حکومت کو اس کے اس مبارک اقدام پر درخور مبارکباد سمجھتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ جلد از جلد ایسے اقدامات کریں گے جن سے ملک کے جملہ قوانین، قرآن کریم کے مطابق ہو جائیں۔

ہم ملک کی "طاہرہ بیٹیوں" کو بھی قابل مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انھیں وہ حقوق ملنے شروع ہو گئے ہیں جو اللہ نے انھیں دیئے تھے اور جنھیں مذہبی پیشوائیت نے اس بُری طرح دبا رکھا تھا۔ عائلی کمیشن کی سفارشات اور ان پر طلوع اسلام کی تنقید، ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" (جلد دوم) میں شامل ہیں۔

۲۔ کمیشن نے اس امر کی بھی سفارش کی تھی کہ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصہ ملنا چاہیئے۔ حکومت نے اس سفارش کو منظور کر کے ایک ایسے ظلم کا ازالہ کیا ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

۳۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ ان سفارشات کو جلد از جلد قانونی حیثیت سے نافذ کر دیں تاکہ مظلوم طبقہ کی دادرسی میں مزید تاخیر نہ ہو۔

۴۔ طلوع اسلام اپنی کوشش جاری رکھے گا کہ ان سفارشات میں ابھی جو حصہ قرآن کے مطابق نہ ہو، اسے قرآن کے بالکل مطابق کر دیا جائے۔ نیز ملک کے دیگر قوانین بھی قرآن کے مطابق ہو جائیں۔ وبیدہ التوفیق۔

آپ دیکھ لیجئے کہ زمانے کے تقاضے کس طرح انسان کو قرآن کے قریب آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔

کراچی کے دوستو!

آؤ اور ہر اتوار کی صبح ساڑھے نو بجے، سندھ اسمبلی ہال (متصل سعید منزل) بندر روڈ میں

مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی زبان سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی، سیاسی اور معاشی مشکلات کا حل کیا پیش کرتا ہے۔

قرآن کی بات ——— مفکر قرآن کی زبان سے

——— بزم طلوع اسلام کراچی کے زیر اہتمام

طاہرہ کے نام

طاہرہ بیٹی! جیتی رہو۔ بڑی مدّت کے بعد تمہارا خط ملا ہے۔ درست ہے کہ جب کوئی ماں اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیم کا پورا پورا خیال رکھے تو اسے دوسرے کاموں کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر وہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا فریضہ کما حقہ ادا کرے تو اسے دوسرے کاموں کے لئے فرصت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ کام اس قدر اہم اور بنیادی ہے کہ نہ اس کی کوئی قیمت ادا کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اور اسے سرانجام دے سکتا ہے۔ ہم مسلسل روتے چلے آ رہے ہیں کہ قوم کے افراد میں کیریکٹر نہیں رہا۔ ہمارے نوجوانوں کی سیرت میں پختگی نہیں۔ نہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین ہے نہ اس نصب العین کے حصول کے لئے تڑپ۔ ساری کی ساری قوم بگڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے سدھارنے اور سنوارنے کی جس قدر کوششیں کی جاتی ہیں، وہ سب ناکام رہتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم درخت کی جڑ کو کاٹ ڈالتے ہیں اور اس کے پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں۔ ہم مرض کی علامات کا علاج کرتے ہیں اور اس کی علت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ ہم امت کی بگڑی ہوئی صورتوں کا ماتم کرتے ہیں لیکن اس قالب کو کبھی نہیں دیکھتے جن میں صورتیں متشکل ہوتی ہیں۔ لفظ اُمّت اُمّ سے بنا ہے جس کے معنی ماں ہیں۔ امت کی تشکیل ماں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ جس قسم کی مائیں، اسی قسم کی امت۔ قوم کا مستقبل جھولا جھلانے والے ہاتھوں سے بنتا اور بگڑتا ہے۔ اس کے نوجوانوں کا بنیادی اور اولین مکتب، ماں کی آغوش ہے۔ بچہ، بعد میں جس درسگاہ میں تعلیم پائے گا اس کے نقوش مٹ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے اولین مکتب (آغوشِ مادر) کے اثرات اَنمٹ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈلر اور ژونگ کی تحقیق کے مطابق، بچے نے جو کچھ بننا ہوتا ہے، تین سال کی عمر تک بن چکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس عمر میں ماں کے سوا بچے کا معلم اور کون ہوتا ہے؟ جس قوم نے اس راز کو پا لیا اس کا مستقبل روشن ہو گیا۔ جس نے اسے نظرانداز کر دیا وہ بربادی کے راستے پر چل نکلی۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے ہاں (خال خال ہی سہی) ابھی تمہارے جیسی مائیں موجود ہیں۔ لہٰذا اگر تم نے اتنا عرصہ خط نہیں لکھا، تو یہ چیز میرے لئے وجہ شکایت نہیں۔ باعثِ مسرت ہے۔ خدا کرے تم اپنے اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں اور زیادہ منہمک ہو جاؤ، اور تمہاری اس محنت و کاوش کے ثمرات، سارے پاکستان کے لئے وجہ شادابیٔ قلب و نظر ہوں ——— یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است۔

تم نے سعیدہ کی بیٹی کا جو قصہ لکھا ہے وہ ہماری اس جہالت کا نتیجہ ہے جس نے ہمارے اچھے بھلے گھروں کو جہنم بنا رکھا ہے۔ جب ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر دیا جائے تو وہ میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے ملنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہمارے ہاں اس نکاح کو رسم تصور کیا جاتا ہے اور اصلی شادی "رخصتی" کو قرار دیا جاتا ہے۔ پھر، نکاح اور رخصتی میں دس بیس دن، یا دو چار ماہ کا وقفہ نہیں ہوتا۔ اس میں کئی کئی برس لگ جاتے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں، ان کا ملنا جلنا تو ایک طرف، انھیں اتنی اجازت بھی نہیں ہوتی کہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں۔ یا کم از کم کھلے بندوں ایک دوسرے کو دیکھ ہی سکیں۔ معاشرے کا رواج ان کے راستے میں حجاب اکبر بن کر حائل رہتا ہے۔ لہٰذا وہ چوری چھپے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھنے سننے والوں کی باتوں کا خیال ان کے دل میں عجیب سی جھجک پیدا کرتا ہے۔ ان کے ملنے پر تو پابندیاں عاید کی جا سکتی ہیں لیکن ان کے خیالات پر تو کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہر وقت انہی خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔ کبھی جی ہی جی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کبھی چوری چوری ملنے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ تازہ امنگیں، ان تدبیروں کو عمل میں لانے پر ابھارتی ہیں۔ لیکن بدنامی کا ڈر انھیں دبانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کشمکش کا جو نفسیاتی اثر ان کے دل و دماغ پر پڑتا ہے ان کی مضرت رسانیوں سے ہمارا معاشرہ یا بے خبر ہے یا بے حس۔ لیکن معاشرہ کی بے خبری یا بے حسی سے ان کی مضرتوں میں کمی نہیں ہو سکتی۔ انھیں رہ رہ کر یہ خیال ستاتا ہے کہ جب خدا کی شریعت نے ہمارا ازدواجی رشتہ قائم کر دیا ہے تو معاشرہ کو کیا حق حاصل ہے کہ ہمارے درمیان روک بن کر کھڑا ہو جائے؟ ان سے ان کے دل میں معاشرہ کی طرف سے تنفر اور سرکشی کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ ادھر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور ادھر ان کی شادی کی تاریخیں بڑھتی چلی جاتی ہیں کبھی لڑکی والے یہ عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ابھی جہیز تیار نہیں ہوا۔ کبھی لڑکے والے معذرت خواہ ہوتے ہیں کہ ہنوز باراتیوں کے کھانے کا انتظام نہیں ہو سکا!۔

یہی تھے نا وہ حالات جن میں سعیدہ کی بیٹی اپنے خاوند سے (یعنی جس لڑکے سے اس کا نکاح ہو چکا تھا) باتیں کرتی ہوئی پائی گئی!۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ اس میں کونسی ناجائز بات تھی جس سے یوں قیامت برپا کر دی گئی! اس بے چاری کا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے اسے یوں بدنام کر دیا گیا؟ کیا شرعاً اور قانوناً یہ دونوں میاں بیوی نہیں تھے؟ جو صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ "عرفاً" میاں بیوی نہیں، ان سے پوچھو کہ یہ "عرف" (رواج) ہے کیا بلا؟ شریعت میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ جسے شریعت کی رو سے "معروف" کہا جائے گا اس کے معنی ہیں ایسی بات جسے قرآن صحیح تسلیم کرے۔ جو قرآن کی رو سے (RECOGNISED) ہو۔ جسے قرآن تسلیم (RECOGNISED) نہ کرے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ عرف (یعنی رسم و رواج) کی خود ساختہ پابندیاں تھیں جنھیں قرآن توڑنے کے لئے آیا تھا۔ ہم نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا اور ان رواجی پابندیوں کو اصل دین قرار دے لیا!۔

جب ان خود عائد کردہ پابندیوں سے دشواریاں پیش آتی ہیں تو ہم چیختے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ان پابندیوں کو دور کرنے کی فکر نہیں کرتے۔ میرے علم میں ایسے واقعات بھی ہیں جن میں محض سرسری تعارف کے بعد لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب جانبین نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھا، یا مزید تحقیق کی گئی تو معاملہ دگرگوں نظر آیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ رشتہ نبھ نہیں سکتا۔ لیکن اب ہو کیا

سکتا تھا؟ اس موقع پر پھر وہی "عرف" (رواج) ان کے لئے حلق کا کانٹا بن گیا۔ اس کا علاج طلاق تھا۔ لیکن طلاق کے نام سے ان پر دہشت طاری ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شادی رچائی ـــــ اور "عرف" سے مجبور ہو کر بڑی دھوم سے رچائی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

سو یہ ہیں میری بیٹی! وہ زنجیریں جن میں ہم نے اپنے آپ کو اس بری طرح سے جکڑ رکھا ہے۔ باقی رہے وہ مولوی صاحب جو فرماتے ہیں کہ خود رسول اللہ کا حضرت عائشہؓ سے نکاح اس وقت ہوا تھا جب (حضرت عائشہؓ کی) عمر چھ سال کی تھی اور رخصتی تین سال بعد ہوئی تھی۔ سو ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ انھیں پڑھایا ہی یہ گیا ہے۔ میں تمہیں اس سے پہلے وضاحت سے بتا چکا ہوں[1] کہ یہ بات ہے ہی سرے سے افسانہ کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی۔ ان کی عمر کسی صورت میں بھی سترہ برس سے کم نہ تھی۔ اس لئے نکاح اور رخصتی میں وقفہ تصور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

میں یہ جانتا ہوں کہ یوں نکاح کرنے کا رواج اس لئے عام ہو رہا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رہا۔ خالی منگنی کی نہ کوئی شرعی حیثیت ہوتی ہے نہ قانونی اس لئے اکثر ہوتا ہے کہ منگنی کے بعد لڑکے والے یا لڑکی والے رشتے سے مکر جاتے ہیں۔ اگر منگنی کی جگہ نکاح کر دیا جائے تو پھر فریقین بندھ جاتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کہ جن تعلقات کی ابتدا ہی عدم اعتماد سے ہو، ان کا انجام کیا ہوگا! کبھی وہ زمانہ تھا کہ سلطنتوں کے معاملات زبانی باتوں سے طے ہو جاتے تھے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ لڑکی یا لڑکے کے رشتے کی بات بھی "زنجیروں" کے ساتھ باندھنی پڑتی ہے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں کا یہ رواج کہ بالغ لڑکی اور لڑکے کا نکاح کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے ازدواجی تعلقات کو تعویق میں ڈال دیا جائے، بڑی بنیادی خرابیوں کا موجب ہے اور قرآن کی تعلیم کے خلاف جاتا ہے اسلئے اسے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نکاح، بالغ لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کا نام ہے جس کی رو سے وہ، احکام خداوندی کے مطابق، باہمی ازدواجی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ ان کے اس عہد کے بعد ان کی ازدواجی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمارے رواج اور رسومات کو اس اصل کے تابع رہنا چاہیئے۔ نکاح تو ایک طرف، اصولی طور پر، میں تو منگنی کے بعد، نکاح اور رخصتی میں بھی غیر معمولی وقفہ کے حق میں نہیں ہوں۔ نفسیاتی طور پر اس کا اثر بھی مضرت رساں ہوتا ہے۔ رشتے اس وقت کرنا چاہیئے جب سب کچھ دیکھ بھال لیا جائے۔ اور اس کے طے ہو جانے کے بعد، باقی مراحل میں غیر معمولی تاخیر بالکل نہیں کرنی چاہیئے۔

تم سعیدہ بہن کو جا کر سمجھاؤ کہ وہ اس بات سے خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔ جو انتظامات اس نے کر رکھے ہیں، ان کے مطابق بیٹی کو گھر سے وداع کرنے کی فکر کرے۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بچوں کو دعا۔ والسلام۔

دعاگو

پرویز

۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

---

[1] یہ مقالہ "طاہرہ کے نام خطوط" کی دوسری جلد میں شائع ہو چکا ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن

جس وقت یہ پرچہ آپ کو ملے گا آپ طلوع اسلام کنونشن میں شرکت کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ کنونشن کا مشروط پروگرام (جس میں ہو سکتا ہے کہ وقت کے تقاضے کے مطابق بعد میں کوئی تبدیلی کرنی پڑے) حسب ذیل ہوگا۔

۷ر اپریل۔ جمعرات۔ بعد نماز عشاء — تعارفی اجلاس

۸ر اپریل۔ جمعہ۔ صبح — خطبہ استقبالیہ (صدر کنونشن کمیٹی)
رپورٹ، ناظم ادارہ طلوع اسلام
خطاب۔ پرویز صاحب
مجلس نمائندگان۔ (نمائندگان سے ہر جگہ مراد کنونشن میں شریک ہونے والے بزموں کے اراکین ہیں)

سہ پہر۔ عام اجلاس۔ پرویز صاحب کا خصوصی خطاب
"اسلامی آئین کے بنیادی اصول"

شب۔ مجلس نمائندگان۔

۹ر اپریل۔ ہفتہ۔ صبح — مجلس نمائندگان (قرار دادیں)

سہ پہر۔ عام اجلاس۔ قرآنی استفسارات و جوابات

شب۔ " " درس قرآن کریم

۱۰ر اپریل۔ اتوار۔ صبح۔ عام اجلاس۔ خصوصی خطاب پرویز صاحب
اجلاس نمائندگان۔ الوداعی پیغام
(خدا حافظ)

اس دفعہ نمائندگان کو اظہار خیالات کے لئے زیادہ وقت دیا جائے گا۔ یہ خیالات صرف طلوع اسلام کی قرآنی تحریک سے متعلق تجاویز اور مشوروں پر مشتمل ہوں گے جنہیں مقررہ وقت کی پابندی سے پیش کرنا ہوگا۔ "نمائندگان" سے مراد وہ بزموں کے منتخب نمائندے ہی نہیں بزموں کے اراکین جو کنونشن میں شریک ہو سکیں گے، وہ بھی اس زمرے میں شامل ہیں۔ لہٰذا اراکین اس مقصد کے لئے تیار ہو کر آئیں۔

۲۔ رضاکار حضرات بدھ کی شام یا زیادہ سے زیادہ جمعرات کی صبح تک ضرور پہنچ جائیں۔

(۳) کنونشن میں وہی حضرات شریک ہو سکیں گے جنھیں کنونشن کمیٹی کی طرف سے دعوت نامے بھیجے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کو یکم اپریل تک دعوت نامہ نہ ملے تو وہ اس کے بعد فوراً اطلاع دیں۔ جن حضرات کو دعوت نامہ نہیں بھیجا جائے گا ان کی طرف سے موصول شدہ رقم واپس کر دی جائے گی۔

(۴) اگر کوئی صاحب (رقم بھیجنے کے بعد) کنونشن میں شرکت سے معذور ہوں تو انھیں اس امر کی اطلاع یکم اپریل تک بھیجدینی ہوگی۔ اس کے بعد ان کی موصول شدہ رقم واپس نہیں کی جائے گی۔

(۵) مبصرین حضرات جنھیں دعوت نامے بھیجے جائیں گے صرف "عام اجلاس" میں شرکت کر سکیں گے۔ جو اجلاس بزم کے اراکین کیلئے مختص ہوں گے مبصرین ان میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

(۶) بزموں کے اراکین کے لئے کیمپ میں رہنا ضروری ہوگا۔ اگر کوئی رکن اپنے انتظام کے ماتحت کسی اور جگہ رہنا چاہے گا تو وہ صرف ان عام اجلاس میں شریک ہو سکے گا جن کے لئے مقامی حضرات کو مدعو کیا جائے گا۔ ایسے اراکین کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ دفتر کنونشن کمیٹی سے اپنے لئے دعوت نامے حاصل کر لیں۔

(۷) خواتین کے لئے کنونشن میں قیام یا طعام کا انتظام نہیں ہوگا۔

(۸) ہلکا سا بستر ہمراہ لائیں۔

(۹) لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر بس اسٹاپ ہے جہاں سے بسیں پاکستان مِنٹ (PAKISTAN MINT) کو آتی ہیں۔ مِنٹ کے اڈہ پر اتر جائیے (یہ شالامار باغ سے ذرا آگے ہے۔ ٹی روڈ پر ہے) مِنٹ کے دروازے کے عین سامنے "طلوع اسلام کنونشن" کا بورڈ آویزاں ہوگا۔ وہاں سے اندر آجائیے۔

(۱۰) پچھلے سال اپیل کی گئی تھی کہ کنونشن کے لئے اپنی کرسیاں اور دیگر سامان خریدنے کے لئے کچھ روپیہ جمع کیا جائے۔ بزموں نے اس کے لئے وعدے کئے تھے۔ جن بزموں نے اپنے وعدے ایفا نہیں کئے، وہ موعودہ رقوم اپنے نمائندے کے ہاتھ بھیجدیں۔

(۱۱) بزموں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ طلوع اسلام کے پمفلٹ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ نمائندگان اس کے لئے اپنی بزموں سے منظوری لے کر آئیں۔ حسب سابق کنونشن میں طلوع اسلام کا اسٹال موجود ہوگا۔

(۱۲) اس دفعہ کنونشن کا بہترین اور حسین ترین تحفہ "لغات القرآن" کی پہلی جلد ہوگی جس کے لئے مدت سے آنکھیں ترس رہی تھیں۔ والسلام

آپ کی شریف آدری اور تعاون کا منتظر

(چوہدری) عبدالرحمٰن

صدر کنونشن کمیٹی

رابطۂ باہمی

——— رپورٹیں ———

لاہور بزم کے پندرہ روزہ اجتماع باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ حالیہ اجلاس میں جو دس مارچ کو نماز مغرب کے بعد ہوا ماہ صیام کے باوجود کافی حاضری تھی۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے اراکین بزم کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا طلوعِ اسلام کے چھ نئے خریدار بنائے گئے۔ بزم میں دو نئے احباب کا اضافہ ہوا۔ رابطۂ عوام کے سلسلہ میں پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ زور و شور سے شروع کیا۔ حاضرین میں سے چھ احباب نے طلوعِ اسلام کنونشن کے انتظامات کے سلسلہ میں بطور رضاکار اپنی خدمات پیش کیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ بزم کے تمام ارکان اس خصوصی اجلاس میں شرکت کریں جو کنونشن کے انتظامات کو آخری شکل دینے کے لئے ۳ اپریل (بوقت نو بجے صبح) کنونشن ہاؤس میں ہوگا۔ اجلاس میں تحریک کی سرگرم مؤید محترمہ نذر فاطمہ کے جواں سال بھائی کی وفات پر دعائے مغفرت کے ساتھ تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

کراچی سندھ اسمبلی ہال کے کامیاب اجتماعات میں پرویز صاحب کی ٹیپ ریکارڈ تقریریں بے حد اثر انگیز ثابت ہو رہی ہیں اور حاضرین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ "سلیم کے نام خطوط" کی دو صد جلدیں مفت تقسیم کی جا رہی ہیں۔ احباب اسلامی آئین کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام کے لٹریچر کی ملک گیر تقسیم کے امکانات پر سنجیدگی سے غور و خوض کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک ہزار پمفلٹ تقسیم ہوئے۔ کنونشن میں شرکت کے لئے اربابِ شوق کا قافلہ بڑی مستعدی سے تیاری کر رہا ہے۔

لائلپور محترم محمد اشرف صاحب کے بعد خان محمد اکرم خاں بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ احباب محسوس کر رہے ہیں کہ اس حسن انتخاب کے باعث بزم میں نئی زندگی ابھر آئے گی۔ ہر ماہانہ اجتماع پر درس قرآن کا انتظام کیا گیا ہے۔ حکیم نور الدین صاحب اس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ احباب میں سے ۹ افراد نے اس وقت تک کنونشن میں بحیثیت نمائندہ

شرکت کا فیصلہ کیا ہے۔ مزید احباب بھی تیار ہو رہے ہیں۔ دو ارکان نے اپنی خدمات بطور رضا کار پیش کی ہیں۔

شکرگڑھ (ضلع سیالکوٹ) بزم کے قیام کے لئے احباب کا اجتماع ہوا۔ اور باضابطہ بزم قائم کر لی گئی ہے۔ ملک بشیر احمد خاں ایڈووکیٹ بزم کے نمائندے منتخب کئے گئے ہیں۔ (ادارہ طلوع اسلام بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے)

گوجرانوالہ بزم کے حالیہ اجلاس میں نمائندہ بزم شیخ محمد اقبال صاحب نے احباب سے خطاب کیا۔ پروفیسر محمد انور بیگ نے اپنی زیر طبع کتاب سے ایک اہم باب پڑھ کر سنایا۔ ریاض احمد صاحب (متعلم بی۔ اے) نے بھی ایک پراثر تقریر کی۔ مکتبہ سے آمدہ پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ کونشن میں شرکت کے لئے ضلع سے تیرہ احباب اپنے نام پیش کر چکے ہیں۔ آئین کمیشن کے صدر جسٹس شہاب الدین صاحب بالقابہ کے نام ایک قرارداد میں اسلامی آئین کے دو اہم اور اساسی نکات پر توجہ دلائی گئی۔

رسول نگر (ضلع گوجرانوالہ) بروز جمعہ بزم کا اجلاس ہوا جس میں اراکین بزم کے علاوہ قصبہ کے دیگر معززین بھی شریک ہوئے۔ مہر غلام حسین صاحب نے طلوع اسلام کے تازہ شمارہ سے روزوں کے احکام اور فرائضِ رسالت کے موضوع پر پرویز صاحب کا مقالہ پڑھ کر سنایا۔

پنڈ دادنخاں (ضلع جہلم) بزم نے اپنے حالیہ اجلاس میں آئندہ سال کے لئے خواجہ خدا بخش صاحب کو نمائندہ منتخب کیا ہے۔ پانچ ارکان کونشن میں بطور نمائندہ شرکت کریں گے۔ لٹریچر کی تقسیم جاری ہے اور احباب بزم کے اجلاس سے پوری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

چک ۷۱ شمالی (ضلع سرگودھا) ادارہ کے پمفلٹوں کی تقسیم جاری ہے۔ بزم نے ادارہ کی مطبوعات سرگودھا شہر میں برائے مطالعہ تقسیم کر رکھی ہیں۔ ان مطبوعات کی قرآنی فکر سے متاثر ہو کر گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ایک طالب علم نے بزم کی رکنیت قبول کی اور احباب کے ساتھ کونشن میں شرکت بھی کریں گے۔

ضرورتِ رشتہ

ایک "طاہرہ بیٹی" کے لئے عمر ۲۳۔۲۴ سال۔ تعلیم میٹرک۔ امور خانہ داری سے واقف۔ سلیقہ شعار۔ گھرانہ متوسط۔

خ۔ ع۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

طلوعِ اسلام کے پُرانے پرچے مطلوب ہیں

طلوع اسلام کے حسب ذیل شماروں کی شدید ضرورت ہے۔ جو صاحب ہدیتاً یا قیمتاً مرحمت فرما سکیں وہ حسب ذیل پتہ پر مراسلت فرمائیں۔

مطلوبہ شمارے:۔ جلد ۱ تا جلد ۳۔ مکمل۔ جلد ۵ شمارہ ۵۔ جلد ۸ شمارہ ۱۴۔

پتہ:۔ ناظم ادارہ علوم اسلامیہ۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ (انڈیا)

عصرِ حاضر کی مایۂ ناز کتاب

لغات القرآن

پرویز

جس سے نہ صرف قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے بلکہ
پورے کا پورا قرآن نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

شائع کردہ:۔ ادارۂ طلوعِ اسلام۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ لغات القرآن

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

[جیسا کہ سابقہ پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا، محترم پرویز صاحب کی مایۂ ناز تالیف، لغات القرآن کی پہلی جلد اپریل کے مہینے میں شائع ہو جائے گی۔ اس اعلان کے بعد متعدد احباب کا تقاضا ہے کہ اس کتاب کا تفصیلی تعارف طلوع اسلام کے ذریعے کرا دیا جائے تاکہ قارئین کے ذہن میں اس کا صحیح صحیح تصور آ جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمارے ذہن میں اس سے زیادہ موزوں شکل اور کوئی نہیں آئی کہ لغات القرآن کا پیش لفظ[ص] طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ اس سے اس کتاب کا صحیح اندازہ ہو سکیگا۔ "پیش لفظ" کے بعد لغات کا ایک مادہ بھی بطور نمونہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سے کتاب کے مشمولات کا اور بھی واضح طور پر اندازہ ہو جائے گا۔ پہلے پیش لفظ ملاحظہ فرمایئے۔ طلوع اسلام]

قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نوعِ انسان کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ایسے ابدی حقائق پر مشتمل ہے جس پر زمانے کے تغیرات اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اور جو اس قدر عالمتاب اور ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ اور تاریخ کے ہر دور میں انسانی فکر کی امامت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کی کیفیت یہ ہو اس کی زبان کو کس قدر جامع، ہمہ گیر، وسیع، بلند اور عمیق اور اس کے ساتھ کس قدر صاف واضح اور سلیس ہونا چاہیئے۔ ایک مغربی مفکر نے ـــــ جو عیسائیت سے برگشتہ ہو کر ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو انسانی عقل و بصیرت کی تسکین کر سکے ـــــ کہا ہے کہ وہ جس مذہب کی تلاش میں ہے اُس کی کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہیئے ـــــ

جو ایک طرف ایسی سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اور دوسری طرف

[ص] لغات القرآن کے پیش لفظ میں کہیں کہیں تبدیلی کی گئی ہے

اس قدر عمیق اور پُرمعنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔[1]

قرآن کریم کی زبان اس معیار پر بھی صحیح طور پر پوری اترتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مشیت ایزدی نے قرآن کے انقلابی پروگرام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے سب سے پہلے عربوں جیسی قوم کا انتخاب کیا تو نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے اس قوم کے ذہنے یہ فریضہ عاید کر دیا تھا کہ وہ اپنی زبان کو تدریجاً ارتقائی منازل طے کراتے۔ اس مقام تک لے جائے کہ وہ قرآن کے عظیم حقائق کی متحمل ہو سکے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا، تو ایک شاخ (بنی اسرائیل) کے حصے میں نبوت اور حکومت آئی اور دوسری شاخ (بنی اسمٰعیل) کو حجاز کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا گیا۔ جہاں ان کے ہاں (حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد) نہ کوئی نبی مبعوث ہوا، نہ انھیں بادشاہت ملی۔ لیکن یہ شاخ رفتہ رفتہ ایک ایسی قوم بن گئی جو دایۂ فطرت کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی اور نبی آخر الزمانؐ کے پیغام کی اولین مخاطب بننے کی اہل قرار پائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی زبان کو اس قدر جلا دی کہ وہ اپنے آپ کو بجا طور پر عرب (یعنی فصیح البیان) اور دوسروں کو عجم (گونگے) کہا کرتے تھے۔ لفظ عربی کے معنی ہی صاف، واضح اور بیّن کے ہیں۔ اس وقت عربی زبان کی اصل (ORIGIN) اور اسکے ارتقائی مراحل سے متعلق کوئی تحقیقاتی بحث میرے پیشِ نظر نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ "بنی اسرائیل" جہاں صدیوں تک تمدن و حضارت کے حسین اور بلند محلات تعمیر کرنے میں مصروف رہے اور سطوتِ داؤدیؑ اور شوکتِ سلیمانیؑ کے حامل بنے، ان کے بھائی "بنی اسمٰعیل" اس تمام عرصہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک ایسی زبان کی ترتیب و تہذیب میں کوشاں رہے جو دنیا کی ہر زبان سے آگے تھی۔ ہمارے زمانے میں ماہرین علم اللسنہ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اگر تاریخ کے کسی خاص دور میں کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (CONCEPTS) کے مظہر تھے۔ اس ضمن میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ ہندی۔ یورپی (INDO-EUROPEAN) زبانوں میں جس قدر الفاظ مروج ہیں۔ ان کے تصوراتی مشتقات (ROOT-CONCEPTS) کو دیکھا جائے تو ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک سو اکیس تک پہنچتی ہے۔ اور تو اور، جس زمانے میں سنسکرت ایک زندہ زبان تھی۔ اور سورج اور آگ کو دیوتا مانا جاتا تھا اس زمانے میں اس زبان میں سورج کے لئے کل سینتیس[37] الفاظ تھے اور آگ کے لئے پینتیس[35]۔ اس کے برعکس عربوں کو دیکھئے تو ان کے ہاں شہد کے لئے اسّی الفاظ۔ سانپ کے لئے دو سو۔ شیر کے لئے پانچ۔ تلوار کے لئے ایک ہزار۔ اور اونٹ کے لئے پانچ ہزار سات سو چالیس الفاظ موجود تھے[2]۔ اس سے عربوں کے تخیل کی وسعت اور ان کی زبان کی جامعیت کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔

---

[1] JULIAN HUXLEY_ N. Y. TIMES 12. 8. 52

[2] COSMIC CONSCIOUSNESS_ RICHARD MAURICE BUCKE P. P 30. 31

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ (۲۶/۱۹۲-۱۹۵)

اور یہ (قرآن) کائنات کے نشوونما دینے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ روح الامین اسے لے کر تیرے قلب پر نازل ہوا ہے۔ تاکہ تو زمرۂ انبیاء میں شامل ہو جائے جو لوگوں کو ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتے ہیں۔ (یہ قرآن) عربی مبین (بات کو کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان) میں (نازل ہوا ہے)

یہ تو تھا اُس زبان کے متعلق جس میں قرآن نازل ہوا۔ خود قرآن کے متعلق ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۲/۲)

ہم نے اس (قرآن) کو صاف اور واضح کتاب بنا کر نازل کیا ہے تاکہ (تم بات کو اچھی طرح) سمجھ سکو۔

دوسری جگہ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (۴۳/۳) کہا ہے۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے معنی "قرآن بزبانِ عربی" بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ قرآن واضح اور کھول کر بات کرنے والا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورہ الرعد میں ہے کہ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (۱۳/۳۷) "اور اس طرح ہم نے اسے واضح کتاب (کی شکل میں) نازل کیا"۔ (نیز ۴۲/۷، ۴۶/۱۲) سورہ زمر میں قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کیساتھ غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸) کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہ قرآن اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس کے مطالب میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ سورۂ کہف میں ہے وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱۸/۱) "اور اس میں کوئی پیچ و خم نہیں رہنے دیا"۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱/۳) "یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات الگ الگ کر کے نکھار کر بیان کی گئی ہیں۔ (اس طرح) یہ قرآن صاف اور واضح (ہو گیا ہے) ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن کے حقائق نہایت بلند اور اس کے مطالب غایت درجہ عمیق ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس کا انداز بیان بڑا آسان ہے۔ سورۂ دخان میں ہے فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۴/۵۸) "اے رسول ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں"۔ سورۂ قمر میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۷) "یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اپنے مطالب میں بڑا صاف، واضح اور آسان ہے لیکن اس کے سمجھنے کے لئے بہرحال عربی زبان کا جاننا ضروری ہے یہ بات قرآن ہی سے مخصوص نہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب ہو، جب تک آپ اس زبان کو نہیں سمجھتے جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے۔ آپ اس کتاب کے مطالب کو کماحقہ نہیں سمجھ سکتے۔

عربی زبان کی وسعت و جامعیت کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ لیکن یہ معلوم کر کے غالباً آپ کو حیرت ہوگی کہ قرآن کریم نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے جو اس زبان میں لکھی گئی۔[1] عربوں کے ہاں شعر و شاعری کا زیادہ رواج تھا۔ اس لئے ان کی زبان کا تمامتر ذخیرہ اشعار کی شکل میں تھا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ (زبانی) آگے منتقل ہوتا چلا آرہا تھا۔ جسے آج عربی لٹریچر کہا جاتا ہے۔ وہ بیشتر عباسیوں کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں کتب احادیث و سیر و تاریخ و آثار مرتب ہوئیں۔ قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئیں۔ عربی ادب کی کتابیں تالیف ہوئیں۔ اس زبان کے صرف و نحو کے قواعد مدون ہوئے۔ لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں وہ (باستثنائے معدودے چند) سب غیر عرب (یعنی عجمی) تھے۔ یہی کتابیں عربی زبان کا اولین سرمایہ ہیں۔

علم اللسان کے ماہرین اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ زبان کے الفاظ تو (بالعموم) اپنی اصلی حالت پر رہتے ہیں لیکن مرورِ زمانہ سے ان کے معانی اور مفہوم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں جن کی وضاحت زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے اس لئے میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ عربی زبان پر عجمی تصورات کس کس نہج و طریق سے اثر انداز ہوئے اس کی تفصیل علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "الفجر الاسلام" میں شرح و بسط سے دی ہے۔ اس بحث کے آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

> یقیناً اس بارے میں آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا۔

ظاہر ہے کہ جب عربی زبان پر خارجی (غیر عربی) اثرات اس طرح مرتب ہوئے اور اس کے الفاظ کے حقیقی مفہوم میں تبدیلی ہوگئی تو اس زبان کے جو الفاظ قرآن میں آئے تھے ان کے مفہوم میں بھی فرق آگیا۔ اور یہی تبدیل شدہ مفہوم (بالعموم) ہماری کتب تفاسیر میں درج ہوگیا جن کی ابتدا ہی اس دور میں ہوئی تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوئی جس کی وجہ سے ہماری کتب تفاسیر میں قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم آگیا جو قرآنی تصورات کے مطابق نہیں تھا۔ یہ چیز بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے ہم اسے ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں جب تفاسیر لکھنے کی ابتدا ہوئی (یعنی تیسری چوتھی صدی ہجری میں) تو ان کا یہ انداز رکھا گیا کہ قریب قریب ہر اہم آیت کے متعلق کہا گیا کہ اس کی شانِ نزول یہ ہے۔ یعنی فلاں واقعہ یوں ہوا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے اس آیت کا مفہوم اس واقعہ کی روشنی میں متعین کر لیا گیا۔ یہ مفہوم اس آیت کی تفسیر قرار پا گیا۔ جو تفاسیر ان کے بعد لکھی گئیں ان میں متقدمین کا اتباع ہوتا چلا گیا۔ اس طرح متعلقہ آیات کی وہ تفسیر مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اور چونکہ شانِ نزول کی روایات کا انتساب خود نبی اکرمؐ یا صحابہؓ

---

[1] بعض لوگوں نے قرآن کریم سے پہلے عربی زبان میں نثر کی ایک آدھ غیر معروف سی کتاب کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن اس کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ بہرحال یہ قرآن کا دعویٰ نہیں کہ وہ عربی نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ علمی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

کی طرف کیا گیا تھا۔ اس لئے آیات کی وہ تفسیر خود نبی اکرمؐ یا صحابہ کرامؓ کی تفسیر سمجھ لی گئی۔ جب قرآن کریم کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوا تو اس کے الفاظ کا ترجمہ بھی اسی تفسیر کی رُو سے کیا گیا۔ تفسیری روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں بیشتر ضعیف اور وضعی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اکابر ائمہ نے سرے سے ان کا انکار ہی کر دیا ہے۔ مثلاً امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ مغازی۔ ملاحم اور تفسیر[1] لیکن اس کے باوجود ہماری کتب تفاسیر کا مدار بیشتر انہی روایات پر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی ضعیف یا وضعی روایت کی بنا پر قرآنی آیت کی تفسیر کی جائے گی۔ اور اس تفسیر کی روشنی میں قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کیا جائے گا یا ان کا ترجمہ کیا جائے گا تو وہ مفہوم یا ترجمہ قرآن کا صحیح صحیح مطلب بیان نہیں کرے گا۔ وہ اس سے ہٹا ہوا ہو گا۔ یہ بات ایک مثال سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی۔ سورۃ النساء کی چونتیسویں آیت ہے اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ ..... عَلِيًّا كَبِيْرًا (۴/۳۴) اس میں ابتدائی چار الفاظ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

حالانکہ لغت کی رُو سے ان الفاظ کے معنی ہیں۔ "مرد عورتوں کی روزی مہیا کرنے والے ہیں"۔ یعنی تقسیم عمل کی رُو سے مردوں کا فریضہ کسب معاش ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس لفظ (قَوَّامٌ) کا ترجمہ "حاکم" کس طرح ہو گیا۔ اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (اس کا) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ .... حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے اس پر آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت اتری۔ اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاریؓ اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ میرے خاوند نے مجھے تھپڑ مارا ہے جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے (اس کا) حق نہ تھا دیکھ یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا اور اللہ تعالیٰ نے اور چاہا۔ .... ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ کی لونڈیوں کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمرؓ آئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر مردوں پر دلیر ہو گئیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ پٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرتؐ کے پاس آئیں تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا۔ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو جو تم میں سے اپنی عورتوں کو زدوکوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظمؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں اس روز ناچاقی ہو گئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو

---

[1] تذکرہ الموضوعات الشیخ محمد طاہر۔ بحوالہ مقدمہ معارف القرآن ص۲۸۔ از علامہ اسلم جیراجپوری (مرحوم)

مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ اشعثؓ! تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہ سے سنکر یاد کر رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے پوچھا نہ جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا۔ دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا نہیں۔ اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی (نسائیؒ) ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے[1]

ان تفسیری روایات کی رُو سے مرد کی پوزیشن حاکم بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کشاف نے اپنی تفسیر میں "قَوَّامُوْنَ" کا مطلب "مسیطرین" قرار دیا۔ یعنی "داروغے" اور تفسیر جلالین نے "متسلطین" یعنی عورتوں پر غلبہ و تسلط رکھنے والے۔ اس لفظ کا مفہوم کتب لغت میں بھی آگیا۔ اور اسی سے ہمارے ہاں اس کا ترجمہ "حاکم" اور "داروغہ" ہو گیا۔ اس سے ایک بڑا اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ

(۱) جب عربی زبان عباسیوں کے دور میں عجمی اثرات سے ملوث ہو گئی تھی۔ اور

(۲) ہمارے ہاں عربی زبان کا جس قدر اولین تحریری سرمایہ ہے۔ وہ بیشتر اسی دور کا پیدا شدہ ہے۔ خواہ یہ کتب تفاسیر ہوں یا لغت کی کتابیں۔ کتب تاریخ ہوں یا ادبی تصانیف۔ اور کتب تفاسیر میں بھی ضعیف یا وضعی روایات کی وجہ سے قرآنی آیات (والفاظ) کا مفہوم اپنی اصل سے ہٹ گیا تھا۔ تو

(۳) آج اس کی کونسی صورت باقی ہے کہ قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم متعین کیا جا سکے جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔

یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا اچھی طرح سے سمجھ لینا اشد ضروری۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ بات کسی اور زبان سے متعلق ہوتی تو یہ دشواری ایسی ہوتی جس کا غالباً کوئی حل نہ نکل سکتا۔ لیکن عربی زبان کے سلسلے میں بعض عناصر ایسے ہیں جن کی موجودگی میں یہ مسئلہ ایسا نہیں رہتا جس کا حل ناممکن ہو۔ سب سے پہلے یہ کہ (جیسا کہ ابتداءً کہا جا چکا ہے) نزولِ قرآن سے پہلے عربی زبان کا تمام تر ذخیرہ ان کے شعراء کے کلام میں محفوظ تھا۔ عربوں کے معاشرے میں شعراء کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ نیز ان کی شاعری بھی زیادہ تر مختلف قبائل کے محاسن و خصائص اور ان کے مدِ مقابل قبائل کے معائب و ذمائم سے متعلق ہوتی تھی۔ اس لئے یہ اشعار بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نثر کو اگر ضبطِ تحریر میں نہ لایا جائے تو اس کا علیٰ حالہٖ آگے منتقل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن شعر کی کیفیت یہ نہیں۔ اسے جب بھی زبانی یاد کیا جائے گا اور دہرایا جائے گا تو اس کے الفاظ اور الفاظ کی ترتیب اسی حالت میں رہے گی۔ یعنی شعر بالفاظہٖ آگے منتقل ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ قبل از اسلام کے شعراء کا کلام بلفظہٖ اور بجنسہٖ آگے منتقل ہوتا رہا۔ تا آنکہ وہ (عباسیوں کے عہد میں) ضبطِ تحریر میں آگیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں بہت سے وضعی اشعار بھی شعرائے جاہلیہ کی طرف منسوب کر کے ان کے کلام میں شامل کر دیئے گئے۔ لیکن اس سے اس مقصد پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا جس کے لئے ہم نے اس مقام پر اس داستان کو پیش کیا ہے۔ وضعی اشعار کی زبان لامحالہ وہی رکھنی پڑتی تھی جو اصلی اشعار

---

[1] تفسیر ابن کثیر۔ المترجم مولانا محمد جوناگڑھی (مرحوم) پارہ پنجم صـ۲۱-۲۲

کی زبان تھی۔ ایسا نہ کیا جاتا تو اصل اور نقل میں فوراً تمیز ہو جاتی۔ بہرحال شعرائے جاہلیہ کے کلام کا بیشتر حصہ اپنے اصلی الفاظ میں عربی ادب کی کتابوں میں مدون اور محفوظ ہو گیا۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں انہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں جن معانی میں وہ ان اشعار میں استعمال ہوئے تھے۔ اور جن سے زمانہ نزولِ قرآن کے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں قرآن کریم کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ اشعار (ادب کی کتابوں کے علاوہ) عربی زبان کی مستند لغت کی کتابوں میں بھی آچکے ہیں۔ اور ان میں ان کے الفاظ کے معانی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ معانی بعد میں مرتب ہونے والی کتب لغت نے، اول الذکر کتابوں کی سند سے اپنے ہاں درج کر لئے ہیں۔

(۴) یہ تو وہ خارجی عنصر جس کے ذریعے یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ فلاں لفظ سے، زمانۂ نزول قرآن میں، کیا مفہوم لیا جاتا تھا لیکن اس کے علاوہ عربی کی ایک داخلی خصوصیت ایسی ہے جو خارجی موثرات سے اثر پذیر نہیں ہو سکتی۔ اور جس پر غور و فکر سے اس کے الفاظ کے صحیح مفہوم تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا۔ عربی زبان کے ہر لفظ کا ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو اپنے بنیادی معنی رکھتا ہے۔ گرامر کے قواعد کی رُو سے اس مادہ کی شکلیں خواہ کیسی ہی کیوں نہ بدلتی رہیں، اس کے بنیادی معانی کی جھلک ہر شکل میں موجود رہتی ہے[1]۔ مادہ کے بنیادی معانی تو ایک طرف، اس سلسلہ میں یہاں تک بھی متعین ہے کہ اگر مادہ میں فلاں حروف (مثلاً ح اور ب) اکٹھے آئیں تو اس میں فلاں مفہوم پایا جائے گا اور فلاں حروف (مثلاً ص اور ت) اکٹھے آئیں تو فلاں مفہوم۔ لہٰذا اگر دورِ زمانہ سے کوئی لفظ کسی اور معنوں میں بھی استعمال ہونے لگ جائے تو اس کے مادہ سے بتایا جا سکتا ہے کہ ابتداءً یہ لفظ کس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس طریق سے یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ جو الفاظ قرآن کریم میں آئے ہیں۔ زمانۂ نزول قرآن میں ان سے کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

۵۔ اس باب میں تیسرا عنصر یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سر پر کھلا ہوا آسمان جس میں چمکتے تارے اور جگمگاتے چاند سورج۔ سامنے وسیع و عریض صحرا جس میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور کہیں کہیں پہاڑیاں۔ پانی کے چشمے۔ زندگی کے مراکز۔ ان کے گرد ہری ہری گھاس۔ سرو قامت کھجوروں کے جھنڈ۔ کہیں کہیں انگوروں کی بیلیں اور اناروں کے پیڑ۔ ان کے آس پاس ان صحرا نشینوں کے خیمے۔ خیموں کے اندر نہایت مختصر سامانِ زیست۔ ان میں سب سے زیادہ قیمتی متاع ان کے ہتھیار ــــ تلوار، تیر۔ کمان۔ نیزہ۔ ڈھال۔ خنجر ــــ سامنے چراگاہ میں ان کے مویشی ــــ اونٹ، گھوڑے۔ بھیڑیں۔ بکریاں ــــ بس یہ تھی ان کی کل کائنات جس کے گرد ان کی زبان کے تمام مشتقات و مصادر گھومتے تھے۔ چونکہ یہ تمام اشیاء محسوس و مرئی تھیں۔ اس لئے ان کے متعلق جس قدر الفاظ استعمال میں آتے تھے ان کا مفہوم نہایت آسانی سے ذہن میں (بلکہ آنکھوں کے سامنے) آجاتا تھا۔ الفاظ کے صحیح مفہوم کے تعین میں دقت پیش آتی ہے جہاں وہ الفاظ فلسفہ اور مابعد الطبیعیاتی مسائل سے متعلق گفتگو میں استعمال ہوئے

---

[1] اس زبان کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس نے ہر زمانے کی نئی نئی ضرورتوں کے ماتحت نئے نئے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے لئے مادہ کے بنیادی معنی اور مختلف ابواب کے خواص سامنے ہونے چاہئیں۔ پھر کوئی نیا تصور ایسا نہیں جس کے لئے موزوں لفظ نہ بن سکے۔

ہوں۔ یعنی جہاں بات تجریدی (ABSTRACT) امور کے متعلق ہو۔ خانہ بدوشوں اور صحرانشینوں کے ہاں تجریدی مسائل کا کیا کام! انہی لوگوں کی صاف، ستھری، اجلی، نکھری زبان تھی جسے عربوں کے ہاں سند مانا جاتا تھا۔ یہ زبان تمدن و حضارت کی موشگافیوں اور شہری و درباری تکلفات و تصنعات کی نکات آفرینیوں سے پاک اور صاف تھی۔ ان کی زبان کی سادگی اور پاکیزگی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب (بہت دور جا کر نہیں) حضرت عمرؓ کے زمانے میں غیر عرب لوگوں سے خلا ملا بڑھنے لگا تو آپ اہل مدینہ سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر کچھ دن گذارو کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں اپنی اصلی شکل میں پائی جاتی ہے۔

ہ۔ مادہ کے بنیادی مفہوم اور ان صحرانشینوں کے ہاں ان الفاظ کے عملی استعمال سے الفاظ کا صحیح مفہوم کس طرح سامنے آجاتا ہے۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایئے۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۲/۱۵۳)۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" لفظ صبر کے جو معنی ہمارے ہاں مروج ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب کسی پر ایسی مصیبت آپڑے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ جہاں انسان یکسر بے چارہ و بےکس و بےبس رہ جائے۔ جہاں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو۔ وہاں ہم کہتے ہیں کہ میاں صبر کرو۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حتیٰ کہ جب کوئی کمزور و ناتواں مظلوم کسی کے ظلم و زیادتی کے خلاف کچھ نہ کر سکے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ "اچھا! میرا صبر"۔ لیکن عربی مبین میں اس مادہ (ص۔ ب۔ ر) کے بنیادی معنی ہیں "کسی شخص کا مطلوبہ شے کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا۔ جم کر کھڑے ہو جانا۔ ثابت قدم رہنا"۔ اب دیکھئے کہ صحرا نشین عرب اس مادہ کو کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ بادل کا وہ ٹکڑا جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر ادھر نہ ہو۔۔۔ اَلصَّبِیْرُ کہلاتا تھا۔ اَلْاَصْبِرَۃُ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے تھے جو صبح جنگل میں چرنے کے لئے چلے جائیں اور شام کو ٹھیک انہی قدموں پر واپس آجائیں۔ نہ کوئی ادھر ادھر ہو نہ پیچھے رہے۔ (تاج العروس) اس سے ظاہر ہے کہ ان (عربوں) کے ہاں صَبْرٌ کے معنی تھے استقامت۔ استقلال، استواری، ثابت قدمی۔ ایک اصول اور روش پر جم کر کھڑے رہنا۔ عمل میں دوام و استمرار۔ یہ ہے صبر کی وہ کیفیت جو انسان کی اپنی ذات میں پیدا ہوتی ہے۔ اب اس سے آگے بڑھیئے۔ اگر کبھی بوجھ یا سواریوں کی کمی بیشی سے کشتی کا توازن بگڑ جائے اور وہ ڈگمگانے لگے تو ملاح ایک بڑا سا پتھر کشتی میں رکھ دیتے تھے جس سے اس کا وزن ہموار ہو جاتا تھا۔ (ہمارے ہاں تلنگے والے اکثر ایسا کرتے ہیں)، اس پتھر کو اَلصَّابُوْرَۃُ کہتے ہیں (محیط المحیط)۔ لہٰذا صبر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی کے پاؤں ڈگمگانے لگیں تو "صبر" سے اس کا توازن برقرار ہو جاتا ہے اور اس کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ اور چونکہ اس قسم کے عمل پیہم اور ثبات و قرار کا نتیجہ کامیابیاں اور کامرانیاں ہوتا ہے، اس لئے اَلصُّبْرَۃُ غلے کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو۔ (تاج العروس)

اس لفظ (صبر) کے طریق استعمال کی ان محسوس مثالوں سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ زمانہ نزول قرآن اہل عرب کے ہاں اس کا مفہوم کیا تھا۔ اس مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ

صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

۷۔ مذکورہ بالا ہر سہ عناصر عربی زبان کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی۔ لیکن بایں ہمہ، صرف اتنی خصوصیات سے قرآن کریم جیسی کتاب کے الفاظ کے صحیح صحیح معانی متعین نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے کہ یہ کتاب ہمارے لئے الدین (خدا کی طرف سے تجویز کردہ انداز زیست کا ضابطہ) ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا صحیح مفہوم یقینی طور پر ہمارے سامنے آجائے۔ تنہا لغت سے یہ نہیں ہو سکتا۔ لغت انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے جس میں سہو و خطا اور خارجی اثرات کا امکان ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، قرآن کریم نے بعض الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاحات اس قدر جامع ہیں کہ تنہا لغت سے وہ عظیم تصورات سامنے نہیں آسکتے جنہیں قرآن نے ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ تقویٰ۔ ایمان۔ اسلام۔ کفر۔ فسق۔ فجور۔ دنیا۔ آخرت۔ جنت۔ جہنم وغیرہ۔ ان اصطلاحات میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات اس جامعیت سے سموئے گئے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ ان اصطلاحات کی جامعیت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ جوں جوں انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم قرآن کریم سے سمجھا جا سکتا ہے۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ اس میں اگر ایک مقام پر ایک بات کہی گئی ہے تو دوسرے مقام پر اس کی وضاحت اس انداز سے کر دی گئی ہے کہ اس سے مقام اوّل کی بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اس انداز کو قرآن نے "تصریف آیات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور اس طرح مطالب کی وضاحت کر دینا۔ سورۃ انعام میں ہے وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (پ ۷) "اور اس طرح ہم آیات کو لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ لوگ کہیں کہ تو نے بات ذہن نشین کرا دی ہے اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لئے واضح کر دیں جو علم و بصیرت سے کام لیں۔" قرآن کریم کا یہ وہ خصوصی انداز ہے جس سے اس کے مطالب واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں اور اس کے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ مثلاً لفظ صبر کے جو لغوی معنی اوپر دیئے گئے ہیں انہیں پیش نظر رکھئے اور پھر قرآن کریم کی طرف آیئے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (پ ۲) یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ الصابرین کن لوگوں کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (پ ۴) "کتنے ہی انبیاء (جیسے گذرے ہیں جن کی معیت میں بہت سے ربانی لوگوں نے (مخالفین کے مقابلے میں) جنگ کی۔ پھر ان تکالیف کی وجہ سے جو انہیں اس طرح اللہ کی راہ میں پیش آئیں نہ وہ سست گام ہوئے نہ ان میں کمزوری آئی۔ اور نہ ہی وہ مخالفین سے مغلوب ہو گئے (یہی وہ) الصابرین ہیں جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے۔" اگلی آیت میں ان کی اس کیفیت کو ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (پ ۴) کی دعا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ثابت قدمی..... عین میدانِ جنگ کی حالت میں کہا ہے اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ..... (پ ۹) "اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو

پر غالب آجائیں گے۔" ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح اور متعین طور پر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم میں صبر سے مفہوم کیا ہے اور صابر کسے کہتے ہیں؟

یہی کیفیت قرآنی اصطلاحات کی بھی ہے۔ ان کے مفہوم کی وضاحت بھی قرآن کریم، تصریفِ آیات کی رُو سے کر دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی عام لفظ ہو یا قرآنی اصطلاح۔ اگر وہ تمام آیات بیک وقت سامنے رکھ لی جائیں جن میں قرآن کریم نے انھیں استعمال کیا ہے یا ان کے مفہوم کو بیان کیا ہے تو ان الفاظ و اصطلاحات کے معانی متعین کرنے میں دشواری نہیں رہتی۔ ان مقامات پر غور و فکر کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ "قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے"۔

۸۔ تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم کے معانی متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ

(i) سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی مفہوم کیا ہے اور خصوصیت کیا۔ اس مادہ کی شکلیں کتنی ہی کیوں نہ بدلیں۔ اس کی خصوصیت کی رُو ہر جگہ میں جھلکتی رہے گی۔

(ii) اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرانشین عربوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ متعین ہو جائے گا کہ ان کے ہاں اس مادہ کا تصوّر (CONCEPT) کیا تھا۔ واضح رہے کہ جب تک تصورات (CONCEPTS) کا تعین نہ کیا جائے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر دورِ حاضر میں (SEMANTICS) نے بڑی روشنی ڈالی ہے۔ اور علم اللسان کا یہ شعبہ الفاظ کی روح تک پہنچنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔

(iii) اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے۔ اور اس نے اسے کس کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔ ان مقامات سے اس لفظ کا قرآنی تصوّر (QURANIC CONCEPT) سامنے آجائے گا۔

(iv) سب سے بڑی چیز کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصوّر سامنے ہونا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے تصورات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ خارجی اثرات کو ایک طرف رکھ کر قرآن کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کیا جائے۔

یہ ہے وہ طریق جس سے قرآن کے الفاظ اور آیات کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ جمال الدین افغانیؒ کے شاگردِ رشید ـــــ اور سید رشید رضاؒ کے استاذ ـــــ امام شیخ محمد عبدہٗ (علیہ الرحمۃ) نے "تفسیر المنار" کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے اعلیٰ مراتب کے سلسلہ میں بعض اہم امور بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

> اس سلسلہ میں پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والے مفرد الفاظ کے حقیقی معنی سمجھے۔ یعنی یہ معلوم کرے کہ ان الفاظ کو اہلِ عرب کیونکر استعمال کرتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی دوسرے کے قول و فہم پر بھروسہ نہ کرے۔ نہ اس پر اکتفا کرے۔ اس لئے کہ بہت سے الفاظ زمانۂ نزولِ قرآن میں کسی خاص مطلب و معنی کو ادا کرنے کے

لئے استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں، تھوڑا یا زیادہ عرصہ گذرنے پر، ان کے دوسرے معنی کئے جانے لگے۔ مثلاً لفظ "تاویل" ہے جو تفسیر کے معنوں میں مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ دوسرے معنوں میں آیا ہے یعنی انجام کار۔ عاقبت۔ قرآن کے وعدہ وعید کا نتیجہ ظاہر ہونا۔[1] اس ضمن میں قرآن کریم میں غور و فکر کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملت میں بعد میں پیدا ہونے والی اصطلاحات کی تحقیق کرے اور پھر ان میں اور قرآن میں آنے والے الفاظ میں فرق کرے۔ اکثر مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ ان اصطلاحات کی رُو سے کرتے ہیں جو پہلی تین صدیوں میں ملت میں رائج ہو چکی تھیں۔ قرآن پر غور کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معانی لیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں لئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہتر طریق یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لے اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کرے۔ بعض اوقات وہ دیکھیگا کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "ہدیٰ" وغیرہ۔ ان مقامات پر غور و فکر سے معلوم ہو جائے گا کہ فلاں مقام پر اس لفظ کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔ قرآن کا ایک مقام دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ اسی طرح، کسی خاص لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کے لئے قانون یہ ہوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت اور موافقت رکھتے ہوں۔ پورے موضوع و مطالب سے اتفاق رکھتے ہوں۔ اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

۹۔ میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میری زندگی بچپن سے لے کر اس وقت تک، اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے۔ ابتداً میں نے بھی (جیسا کہ ہمارے ہاں دستور ہے) اس کا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا۔ لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ

منزل و مقصود قرآں دیگر است　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اُس وقت جب میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی نے (منجملہ دیگر امور) یہ اہم نکتہ بھی سمجھ میں آیا کہ قرآن کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہیئے۔ "تصریف آیات" کی رُو سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تبویب القرآن کی ضرورت تھی۔ یعنی ایک عنوان سے متعلق قرآن کریم کی تمام آیات کو یکجا کر کے انھیں مربوط مضمون کی شکل میں

---

[1] سید رشید رضاؒ نے اس سلسلہ میں لفظ "اَلْوَلِیُّ" کی مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن میں اس لفظ کے معنی ناصر و مددگار، حامی اور دوست کے ہیں۔ "اولیاء اللہ" کے معنی ہیں وہ اہل ایمان و تقویٰ جو اللہ کے دین کے حامی و مددگار بنیں۔ لیکن بعد میں یہ اصطلاح چل پڑی کہ وہ لوگ جو کرامات و خوارق کا مظاہرہ کریں اور ظاہری اسباب سے ماوراء قوانین فطرت میں تصرف کریں انھیں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ صحابہ کبارؓ "اولیاء اللہ" کے یہ معنی جانتے ہی نہیں تھے۔ (المنار)

مرتب کرنا۔ اگرچہ تبویب القرآن کے متعلق اس سے پہلے بھی کوششیں ہوتی رہی تھیں۔ لیکن جو خاکہ علامہ اقبالؒ کے پیش نظر تھا اس کے مطابق کوئی کتاب مجھے نہ مل سکی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کوئی جماعت یا مجھ سے زیادہ موزوں فرد اس اہم کام کے لئے تیار ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور بالآخر یہ اہم کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ پہلے سینکڑوں عنوانات کے ماتحت قرآنی آیات کی تبویب (CLASSIFICATION) کی۔ اس میں کئی برس لگ گئے۔ پھر ہر موضوع کو انسائیکلوپیڈیا کے انداز میں مربوط مقالہ کی شکل میں مرتب کیا۔ اس کے بعد ان مقالات کو مختلف مجلدات میں تقسیم کیا۔ اس طرح "معارف القرآن" کا طویل سلسلہ وجود میں آیا۔ اس میں سے من ویزداں۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور برق طور۔ شعلۂ مستور۔ معراج انسانیت۔ شائع ہو چکی ہیں۔ باقی جلدیں بھی اپنے وقت پر شائع ہوتی جائیں گی (انسان نے کیا سوچا؟ بھی اسی سلسلۂ دراز کی ایک کڑی ہے)

۱۰۔ "معارف القرآن" اور میری دیگر تصانیف و مقالات کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے نوجوان تعلیمیافتہ (بالخصوص مذہب گزیدہ) طبقے کے دل میں قرآن کریم کی قدر و منزلت اور عظمت و عقیدت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ میری (سالہا سال کی) محنت اور کوشش کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہمارا نوجوان طبقہ (جو انسانوں کے خود ساختہ مذہب سے گھبرا کر خدا کے عطا فرمودہ دین سے ہی دور بھاگ رہا تھا) کسی طرح قرآن کریم کے قریب آجائے اور اس پر براہِ راست غور و فکر کرنا شروع کر دے۔ میری ان حقیری کوششوں سے (بتوفیق ایزدی) جو نتیجہ برآمد ہوا وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔ ان نوجوانوں کی کثیر تعداد قرآن کریم کے قریب آگئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

یہ طبقہ قرآن کریم کے قریب تو آگیا لیکن جب ان سے کہا گیا کہ وہ اس کتاب عظیم کی تعلیم کو براہِ راست سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کا جواب یہ تھا کہ قرآن کریم نہ تو موجودہ تراجم سے ان کی سمجھ میں آتا ہے نہ تفاسیر سے (وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھے) اس لئے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ طریق بتایا جائے جس سے وہ قرآن کریم کو براہِ راست سمجھنے لگ جائیں۔ یہ مطالبہ کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو عربی زبان سے ناواقف تھے اور وہ بھی جنھوں نے اسے پڑھا تھا۔ میں نے جب ان کی دقت پر غور کیا تو اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ علامہ اقبالؒ نے جب قرآن فہمی کے لئے تصریف آیات کے ساتھ عربی زبان سے واقفیت ضروری بتائی تھی۔ تو عربی زبان سے ان کی مراد قرآن کریم کے الفاظ کا وہ مفہوم تھا جو زمانہ نزول قرآن میں سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک مدت کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ قرآن کریم کے براہِ راست سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں قرآنی الفاظ اور تصورات کا مفہوم اس انداز سے متعین کیا جائے جس کی تصریح پہلے کی جا چکی ہے۔

ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی لغت نہیں۔ اس قسم کا لغت تو ایک طرف مفردات امام راغبؒ کے علاوہ، کم از کم میری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گذری جسے خالص قرآنی الفاظ کا لغت کہا جا سکے۔ آجکل لغات القرآن کے عنوان سے بعض کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن وہ ہمارے پیش نظر مقصد کو پورا نہیں کرتیں۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس طرز پر قرآن کریم کے افہام و تفہیم کی طرح ڈالی تھی۔ اور کچھ الفاظ کے معانی بھی اس انداز سے متعین کئے تھے۔ اگر وہ قرآن کریم کا پورا لغت اس نہج پر مرتب فرما جاتے تو وہ بڑے کام کی چیز

ہوتا۔ ہم نے اپنے ظرف کے مطابق ان کی قرآنی بصیرت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ قرآن کریم کا لغت مرتب کرنا اور وہ بھی اس انداز کا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے جس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ اہلِ علم حضرات بخوبی لگا سکتے ہیں۔ میں نے (جس طرح اس سے پہلے تبویب القرآن کے سلسلہ میں کیا تھا) بڑی کوشش کی کہ اس عظیم اور مشکل کام کے لئے کوئی جماعت تیار ہو جائے۔ لیکن (جس طرح پہلے ناکامی ہوئی تھی) اس میں (بھی) ناکامی ہوئی۔ ادھر یہ دشواری تھی اور اُدھر ان ارباب ذوق کا جنہیں میں قرآن سے قریب لے آیا تھا یہ تقاضا کہ انہیں بتایا جائے کہ وہ قرآن کو براہِ راست کس طرح سمجھیں، شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں جب اپنی طرف نگاہ ڈالتا تھا تو ایسے مشکل اور اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی نہ اپنے اندر کما حقہٗ اہلیت پاتا تھا نہ ہمت۔ ایک مدت دراز تک یہ کشمکش جاری رہی۔ اور آخر الامر مجھے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ بھلی بُری جیسی بھی ہو اس کام کی بنیاد رکھ دینی چاہیئے۔ جب ایک دفعہ اس کی طرح پڑ گئی اور اس نے مفید نتائج مرتب کئے تو پھر دوسرے (اور مجھ سے زیادہ اہلیت رکھنے والے) حضرات اس سے بہتر عمارت استوار کریں گے۔ یہ تھے وہ حالات جن سے مجبور ہو کر میں نے اس لغت کی ترتیب کا فیصلہ کیا۔ سالہا سال کی مسلسل محنت کے بعد جیسا کچھ یہ مرتب ہو سکا ہے آپ کے سامنے ہے۔ اس دشوار گذار سفر میں مجھے بعض اچھے رفقاء کی معیت بھی نصیب ہو گئی۔ نیز کٹھن منازل پر میں نے ان حضرات سے مشورے بھی کئے جو ان مشوروں کے اہل تھے اور آمادہ بہ تعاون۔ مزید اطمینان کی خاطر میں نے اس کا مسودہ ایسے ذی علم احباب کو بھی دکھا لیا جن کی عربی زبان کی استعداد اور قرآنی ذوق کا مجھے علم تھا۔ میں ان تمام احباب کا بصمیم قلب شکر گذار ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس لغت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی ذمہ داری میں وہ شریک نہیں وہ تنہا مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ علامہ اسلم جیراجپوری لغت کی تکمیل سے پہلے انتقال فرما گئے۔ اگر آپ سے وہ ایک نظر دیکھ لیتے تو میرا پورا اطمینان ہو جاتا۔ میرا فہم قرآن ان کی بصیرت قرآنی کا جس قدر رہین کرم ہے اس کے لئے میرا ایک ایک سانس ان کا سپاس گذار ہے۔

۱۱۔ زیر نظر لغت کی ترتیب و تدوین میں سب سے پہلا فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ عربی زبان کے کون سے لغت کو بطورِ اساس و بنیاد سامنے رکھا جائے۔ مروجہ کتب لغت میں تین کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہے ـــــ یعنی لسان العرب۔ تاج العروس۔ اور قاموس۔ (ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب لغت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور خاص خاص شعبوں میں وہ ان سے بھی زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں بہ ہیئتِ مجموعی ان تین کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہے) ـــــ ان تینوں کے محاسن و خصوصیات کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہی طے پایا کہ تاج العروس کو بنیاد قرار دیا جائے۔

تاج العروس، قاموس کی شرح ہے۔ اور چونکہ لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے اس لئے اس میں لسان کی ضروری تفصیلات بھی آگئی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تاج العروس آخری (LATEST) مفصل اور مستند لغت ہے، جس میں اس سے پہلے کی شائع شدہ قریب قریب تمام مستند کتب لغت کا خلاصہ آگیا ہے۔ لسان العرب، ابن مکرم کی تالیف ہے جن کی وفات سنہ ۷۱۱ھ میں ہوئی۔ قاموس کے مؤلف علامہ فیروز آبادی ہیں جن کی وفات سنہ ۸۱۶ھ میں ہوئی۔ تاج العروس کے مؤلف کا پورا نام محب الدین ابن الفیض

السید محمد مرتضیٰ الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی ہے۔ ان کی وفات ۱۲۰۵ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی معرکہ آرا لغت کو مصر میں مدون کیا۔ یہ دس ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ مصر کے مطبع الخیریہ کا طبع شدہ ہے۔ جس پر سن طباعت ۱۳۰۶ھ (بار اول) درج ہے۔ لین کے قول کے مطابق تاج العروس میں لسان العرب کے علاوہ ایک سو مستند کتب لغت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں عربی کا مشہور لغت (LANE'S LEXICON) تاج العروس پر ہی مبنی ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ لغت بڑا سائنٹیفک ہے۔

(۲) تاج العروس کے ساتھ جس کتاب کو ہم نے بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے وہ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب ۵۰۲ھ) کی مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القرآن" ہے یہ قرآنی الفاظ کا لغت ہے اور اس درجہ مقبول اور مشہور کہ اس کے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ کتاب بڑی مختصر ہے۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ مطبع میمنہ (مصر) میں ۱۳۲۴ھ میں چھپا تھا۔

(۳) تیسری اہم کتاب ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی مقاییس اللغۃ ہے جس میں ہر لفظ کا مادہ اور مادہ کے بنیادی معنی دیئے گئے ہیں۔ چونکہ ہمارے لغت کا مرکزی نقطہ، مادہ کے بنیادی معنی ہیں، اس لئے اس میں ابن فارس سے نمایاں استفادہ کیا گیا ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ چھ جلدوں میں مصر میں (۱۹۵۲ء میں) چھپا تھا۔

(۴) اس کے بعد جس کتاب سے زیادہ استفادہ کیا گیا وہ بطرس بستانی کی محیط المحیط ہے۔ یوں تو یہ کتاب مختصر ہے۔ (دو جلدوں میں مکمل ہوئی ہے) لیکن اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ بیروت میں ۱۸۷۰ء میں چھپا تھا۔

یہ وہ کتب لغت ہیں جن کے عام حوالے آپ کو زیر نظر لغت میں ملیں گے۔ ان کے علاوہ اکثر مقامات پر حسب ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

(ا) فقہ اللغۃ۔ ابو منصور ثعالبی کی مشہور کتاب ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بڑی مستند خیال کی جاتی ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ ۱۹۳۸ء میں مصر میں چھپا تھا۔

(ب) اقرب الموارد۔ لغت کی مشہور کتاب ہے جسے سعید الخوری الشرتونی اللبنانی نے مرتب کیا تھا۔ ہمارے پیش نظر نسخہ بیروت میں (۱۸۸۹ء میں) چھپا تھا۔

(ج) منتہی الارب۔ عربی فارسی کا مشہور لغت ہے۔ ہمارے سامنے وہ نسخہ ہے جو مطبع اسلامیہ لاہور میں (۱۹۲۵ء میں) چھپا تھا۔

(د) کتاب الاشتقاق۔ یہ ابن درید کی تصنیف ہے (جن کی وفات ۳۲۱ھ میں ہوئی تھی) لغت میں ابن درید کا مقام بہت بلند ہے اور اس کی یہ کتاب مادہ کے بنیادی معانی معلوم کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ اگرچہ مقاییس اللغۃ جیسی مفصل نہیں اس کے علاوہ ابن درید کی لغت کی مشہور اور نہایت مستند کتاب جمہرۃ اللغۃ سے بھی بعض مقامات میں استفادہ کیا گیا ہے۔

(ہ) العلم الخفاق فی علم الاشتقاق۔ یہ نواب صدیق حسن خان کا مختصر رسالہ ہے لیکن اس میں مادوں کے حروف کی

بنیادی خصوصیات کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

(س) الالفاظ المترادفۃ۔ یہ علی ابن عیسیٰ الرمانی (متوفی سنہ ۳۸۴ھ) کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں مترادفات کے لطیف اور دقیق فرق کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

(ش) لطائف اللغۃ۔ یہ احمد بن مصطفیٰ اللبابیدی (دمشقی) کی کتاب ہے جس میں الفاظ کی لغوی باریکیوں سے بحث کیگئی ہے۔

(ص) کتاب القرطین۔ یہ امام ابن قتیبہ الدینوری (المتوفی سنہ ۲۷۶ھ) کی دو مشہور کتابوں ـــــ مشکل القرآن و غریبہ ـــــ پر مشتمل ہے اور مصر میں سنہ ۱۳۵۵ھ میں چھپی ہے۔ ابن قتیبہ کا مقام علمی دنیا میں بہت بلند ہے۔

(ط) البستان۔ شیخ عبداللہ البستانی اللبنانی (المتوفی سنہ ۱۹۳۰ء) کا یہ لغت سنہ ۱۹۲۷ء میں چھپا تھا۔ اس کا مقدمہ خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔

ان کتب لغت کے علاوہ زمخشری کی تفسیر (کشاف)، تفسیر جلالین اور علامہ محمد عبدہٗ کی شہرہ آفاق تفسیر المنار سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر لغت میں ان کتابوں کے حوالے میں یا تو کتاب کا (پورا یا مخفف) نام دیا گیا ہے یا مصنف کا۔ مثلاً تاج۔ راغب۔ محیط۔ ابن فارس۔ العلم الخفاق وغیرہ۔ علاوہ ازیں بعض مقامات پر دیگر کتب سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان کا نام متعلقہ مقام پر لکھ دیا گیا ہے۔

۱۲۔ اس لغت میں ترتیب (بالعموم) یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے مادہ کے بنیادی معنی دیئے گئے ہیں۔ پھر عربی زبان میں اسکے استعمال کی مثالیں دی گئی ہیں۔ ان مثالوں میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ حتی الامکان محسوس اشیاء کی مثالیں ہوں تاکہ ان سے زیرِ بحث لفظ کا مفہوم محسوس طور پر سامنے آجائے۔ اس طرح اس لفظ کا لغوی مفہوم متعین کرنے کے بعد قرآن کریم کی ان آیات کو درج کیا گیا ہے جن میں وہ لفظ (اپنی مختلف شکلوں) میں آیا ہے۔ ان آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کن کن معانی میں آیا ہے۔ اس کے بعد اہم الفاظ اور اصطلاحات کے ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے قرآن کس قسم کا تصور (CONCEPT) پیش کرتا ہے اور وہ تصور قرآن کریم کی مجموعی تعلیم میں کیا مقام رکھتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ کتاب محض قرآنی الفاظ کا لغت نہیں بلکہ اس میں قرآنی تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جن دوستوں نے اس لغت کا مسودہ (پورا یا اس کا بعض حصہ) دیکھا، ان کی رائے یہ ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کر لینے کے بعد قرآن کا طالب علم کسی تفسیر کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ اس خصوصیت کے پیشِ نظر ہم چاہتے تھے کہ اس لغت کا نام کچھ اور رکھا جائے جس سے اس کی یہ خصوصیت نمایاں طور پر سامنے آجائے۔ لیکن چونکہ اس سے اس کی بنیادی خصوصیت (یعنی قرآنی الفاظ کے معانی) کے نظر سے اوجھل ہو جانے کا امکان تھا، اس لئے اس کا نام لغات القرآن ہی تجویز کیا گیا ہے

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ قرآن کریم کے الفاظ (مفردات) کا لغت ہے۔ پوری کی پوری عربی زبان کا لغت نہیں۔ اس لئے نہ تو اس میں عربی زبان کے تمام الفاظ آئے ہیں اور نہ ہی الفاظ کی تشریح میں ادبی بحثوں کو چھیڑا گیا ہے۔

اس میں ہر لفظ کے متعلق صرف اس حد تک بحث کی گئی ہے جس حد تک اسے قرآن نے لیا ہے نیز قرآن کریم کی آیات بھی تمام کی تمام نہیں دی گئیں۔ مثلاً اگر ایک لفظ قرآن کی بیس آیات میں (ایک ہی مفہوم میں) آیا ہے۔ تو ان میں سے صرف ایک آیت دی گئی ہے البتہ جہاں مختلف آیات میں ایک لفظ کو جداگانہ مفہوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں وہ تمام آیات درج کر دی گئی ہیں۔ جہاں کسی آیت کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی وہاں اس کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ آپ ان تمام آیات کو قرآن کریم سے نکال کر دیکھ لیں۔

۱۳۔ اس ضمن میں ایک اور اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں قاعدہ ہے، الفاظ کے ایک معنی حقیقی ہوتے ہیں اور ایک مجازی۔ مثلاً جب ہم کہیں کہ "وہ تو شیر ہے" تو اس سے مراد وہ (شیر) جانور نہیں جو جنگل میں رہتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ شیر جیسا بہادر ہے۔ لفظ "شیر" کے حقیقی معنی "جنگل کا ایک طاقتور جانور" ہیں۔ اور (مندرجہ بالا فقرہ میں) مجازی معنی "بڑا بہادر"۔ یہ حقیقی اور مجازی معانی کی صرف ایک مثال ہے۔ بلند پایہ تصانیف میں اور بھی بہت سے طرق واسالیب بیان ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ کے مجازی معنی مقصود ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ انداز بیان، تشبیہات اور استعارات پر مشتمل (SYMBOLICAL) ہوتا ہے[1] لیکن یہ بھی کوئی ضروری شرط نہیں۔ اس ضمن میں ابنؒ قتیبہ نے لکھا ہے۔

> عرب کے لوگ کلام میں مجازی معنی بھی لیتے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں بات کہنے کے کئی طریقے اور کئی اسلوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، حذف، تکرار، اخفار، اظہار، تعریض، افصاح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جماعت کو واحد کے صیغے سے۔ خاص لفظ سے عام مراد لینا اور عام لفظ سے خاص۔ غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں جو آپ کو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں۔ ..... قرآن کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا، قرآن کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کر سکتا..... کیونکہ عجمی زبانوں میں مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی ایک آیت ہے فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (۱۸/۱۱)[2] اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کر لیں تو اس سے وہ مفہوم نہیں سمجھا جا سکے گا۔

---

[1] اس قسم کے اسلوب بیان کے متعلق مشہور انگریز ادیب (CHESTERTON) لکھتا ہے۔

NOT LITERALLY TRUE, BUT ONLY REALLY TRUE (QUOTED BY W.M URBAN IN_ HUMANITY AND DEITY_ P 117)

[2] یہ آیت اصحاب کہف سے متعلق ہے۔ شاہ رفیع الدینؒ اس کا لفظی ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ "پس پردہ مارا ہم نے اوپر کانوں ان کے کے بیچ غار کے برس کئی ایک"۔

جو ان الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ یوں کہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے انھیں چند سال تک سکھائے رکھا۔ تو اب بھی آپ نے مفہوم کا ترجمہ تو کر دیا۔ الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔ (قرطین جلد ۲ ص ۱۶۳)

یہ انداز بیان عام کتابوں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن جس کتاب عظیم کی یہ کیفیت ہو کہ اس کے حقائق کو تمام نوع انسان کے لئے، ہر زمانے میں، مشعل ہدایت بننا ہو، اس کا بیشتر حصہ اسی انداز کا ہونا چاہیئے۔ اس سے ہر دور کے ارباب علم و بصیرت اور اصحاب فکر و تدبر اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق، الفاظ کے مجازی معانی سے قرآنی حقائق کو سمجھتے چلے جائیں گے۔ اور یوں جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، قرآنی حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آتے جائیں گے۔ اس طرح اس کتاب سے بلند پایہ مفکر بھی اسی طرح بہرہ یاب ہو سکتے ہیں جس طرح عام انسان مستفید ہوتے ہیں۔

لہٰذا قرآنی الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ متعلقہ آیت میں فلاں لفظ کے معنی حقیقی لئے جانے چاہئیں یا مجازی۔ زیر نظر لغت میں اس کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن مقامات پر ہم نے کسی لفظ کے مجازی معنی لئے ہیں وہاں (بالضرور) اس کے مجازی معنی لئے جائیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ اس کے بعد متعلقہ آیت میں جو معنی (حقیقی یا مجازی) زیادہ موزوں نظر آئیں انھیں اختیار کر لینا چاہیئے۔ یہی کیفیت ان مقامات کی بھی ہے جہاں ہم نے قرآنی آیات سے کوئی خاص مفہوم مستنبط کیا ہے۔ قارئین میں سے جنھیں ہمارے مفہوم سے اختلاف ہو وہ اپنے لئے خود مفہوم متعین کر لیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ زیر نظر لغت میں جو حصہ الفاظ کے لغوی معنی سے متعلق ہے اُسے مستند سمجھا جائے (اس لئے کہ وہ مستند کتب لغت سے ماخوذ ہے) لیکن جو کچھ ہم نے اپنی طرف سے کہا ہے وہ اگر صحیح نظر آئے تو فبہا۔ ورنہ خود غور و فکر سے دوسرا مفہوم متعین کر لیا جائے۔

بعض الفاظ کے سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ جو معانی اس لغت میں دیئے گئے ہیں وہ قرآن کریم کے ان تراجم سے مختلف ہوں جو ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہیں (تراجم کی عام طور پر کمزوری کے متعلق ہم پہلے لکھ چکے ہیں) ایسی صورت میں آپ اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ ہم نے ہر لفظ کے لغوی معانی کی سند میں اس کتاب کا حوالہ دے دیا ہے جہاں سے وہ معانی لئے گئے ہیں۔ اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ارباب علم کے نزدیک ان کی حیثیت مستند ہے۔ ان کتابوں میں بعض اوقات ان کے مؤلفین نے (لغوی معانی کے علاوہ) خود اپنی رائے بھی دی ہے۔ ہم نے بعض مقامات پر ان آراء سے اختلاف کیا ہے۔ اس لئے کہ اشخاص کی آراء ان کی ذاتی استعداد، رجحانات و میلانات، نیز خود اس زمانے کی علمی سطح اور عام فضا کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں وہ اشخاص تربیت پاتے ہیں۔ اس لئے دوسروں پر ان آراء کی پابندی لازم نہیں ہوتی۔ ایسے مقامات پر ہم نے اپنے فہم و بصیرت (اور اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق) جو بہتر سمجھا ہے لکھ دیا ہے۔

اردو زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ داخل ہیں۔ لیکن یہ الفاظ اردو میں ان معانی سے مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں جن معانی میں وہ بنیادی طور پر عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ زیر نظر لغت میں جب اس قسم کے الفاظ (ہماری) اردو زبان کی عمارت میں آئیں تو ان کے وہی معانی سمجھے جائیں جن معانی میں وہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک لفظ کا ذکر خصوصیت سے کرنا ضروری ہے جو آپ کو زیر نظر لغت میں بکثرت ملے گا۔ وہ لفظ ہے "قانون"۔

ہمارے ہاں قانون سے عام طور پر مفہوم وہ (LAWS) لئے جاتے ہیں جن کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن لفظ قانون کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ قانون سے مراد یہ محکم اصول ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مثلاً "قانونِ فطرت" سے مراد ہیں وہ لگے بندھے اصول و ضوابط جن کے مطابق خارجی کائنات کا محیر العقول سلسلہ اس نظم و ضبط سے چل رہا ہے۔ "قوانینِ خداوندی" سے مراد ہیں زندگی سے متعلق وہ اصول و ضوابط جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ وقس علیٰ ذالک۔ لہٰذا اس لغت میں جہاں یہ لفظ (قانون) آئے سیاق و سباق کے مطابق اس کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے۔

بعض اوقات آپ دیکھیں گے کہ لغت کی رُو سے ایک ہی لفظ کے متعدد معانی دیئے گئے ہیں۔ اس وقت ہم اس چیز پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ایک لفظ کے متعدد (اور کسی جگہ متضاد) معانی کیوں آ گئے ہیں۔ یہ علم الالسنہ کا ایک اہم مسئلہ ہے اور ہمارے موضوع سے خارج)۔ بالعموم یہ اختلافِ معانی ان الفاظ کے طریقِ استعمال کی بنا پر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں وہ لفظ جس مقام پر آئے سیاق و سباق بتا دے گا کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے یا تصریفِ آیات سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ یعنی قرآن کریم کی ان متعدد آیات کو سامنے لانے سے جہاں وہ لفظ آیا ہے۔ ہم نے اس لغت میں یہی طریق اختیار کیا ہے۔

(۱۴) ان اہم امور کے علاوہ ذیل کے مختصر نقاط بھی پیشِ نظر رہنے ضروری ہیں۔

(ا) لغت میں حروفِ مقطعات کے معانی نہیں دیئے گئے۔ یہ قرآنی مفردات نہیں بلکہ مخففات ہیں۔ ان کے متعلق ہم اپنا نقطۂ نظر مفہوم القرآن میں بیان کریں گے اور وہیں ان کا مفہوم بھی دیں گے۔ (مفہوم القرآن کا تعارف ذرا آگے چل کر آتا ہے)

(ب) عربی زبان میں حروف کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی تفصیلی بحث ایک مستقل موضوع ہے جو اس قسم کی لغت کی کتاب میں جو آپ کے پیشِ نظر ہے ضمنی طور پر بیان نہیں کی جا سکتی۔ بنا بریں اس لغت میں حروف کی بحث کو صرف اس حد تک محدود رکھا گیا ہے۔ جہاں تک یہ بحث قرآنی آیات کے سمجھنے میں مفید تصور کی گئی ہے۔

(ج) بعض حروف کے متعلق لکھا گیا ہے کہ فلاں آیت میں یہ "زائد" ہے۔ زائد کے یہ معنی نہیں کہ وہ بلا ضرورت استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حرف کے (اس مقام پر) الگ معنی کچھ نہیں۔ لیکن اہلِ زبان اسے ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور اس سے کلام میں خاص وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر قرآن اسے استعمال نہ کرتا تو قرآن کا انداز غیر فصیح ہو جاتا۔

(د) عربی الفاظ کے مادے بالعموم سہ حرفی (ثلاثی) ہوتے ہیں لیکن بعض مادے چار حرفی (رباعی) بھی ہوتے ہیں۔ عام کتبِ لغت میں (رباعی) کو بھی ثلاثی کے تابع دیدیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی اس باب میں انہی کا اتباع کیا ہے بجز ان مقامات کے جہاں رباعی مادہ کا الگ دیا جانا ضروری خیال کیا گیا ہے۔

(۲) حضرات انبیائے کرامؑ اور اقوامِ سابقہ کا تعارف الگ عنوانات کے تحت کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعارف (لغت کی مناسبت سے) اجمالی ہے۔ تفصیلی تعارف میری دوسری تصانیف (مثلاً جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۳) قرآنی آیات کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے کہ اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً (۷/۹۲) سے مراد ہے ساتویں سورۃ

(سورۂ اعراف) کی آیت ۹۲۔ چونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں دو ایک کا فرق ہوتا ہے[1] اس لئے اگر زیرِ نظر لغت میں کوئی آیت حوالہ کے مطابق نہ ملے تو ایک دو آیت آگے پیچھے دیکھ لیں۔ آیات کو اگر آپ قرآن کریم کے نسخہ سے ملالیں تو بہتر ہوگا۔ تاکہ اگر ان میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس کی تصحیح ہو جائے۔ قرآنی آیات میں صحت کا بالخصوص خیال رکھنا چاہیئے۔

(ص) لغت میں عند الضرورت حوالہ کے ساتھ قرآنی آیات بھی درج کر دی گئی ہیں۔ لیکن جہاں آیت درج نہ کی گئی ہو اور صرف حوالہ دیا گیا ہو وہاں آپ متعلقہ آیت قرآن کریم سے خود نکال کر دیکھ لیں۔ اس سے بات واضح ہو جائے گی۔

(ط) بعض اوقات "قرآن کریم" یا "قرآن مجید" کے بجائے صرف "قرآن" لکھا ہوا ملے گا۔ اسے عدمِ احترام پر محمول نہ کیا جائے۔ قرآن کریم بہرحال و بہرنوع واجب الاحترام ہے۔ خواہ اس کے ساتھ احترام کا لفظ آئے یا نہ آئے۔ جہاں ایسا لفظ موجود نہ ہو وہاں آپ اس کا اضافہ خود کر لیں۔

۱۵۔ یہ لغت اوّلاً و اساساً ان حضرات کے لئے مرتب کیا گیا ہے جو عربی زبان سے واقف نہیں۔ اس لئے

(۱) اس میں علمی اصطلاحات سے اجتناب کیا گیا ہے اور بات عام فہم الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ نیز کوشش کی گئی ہے کہ اس کا انداز سلیس اور سادہ ہو تاکہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ البتہ جہاں گفتگو ہی کسی علمی یا فنی مسئلہ کے متعلق ہو وہاں اسلوبِ بیان کا فنی یا نسبتاً مشکل ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

(۲) لغت سے پہلے، قریب ستر صفحات میں، عربی زبان کے گرامر کے قواعد آسان اور غیر فنی زبان میں دیئے گئے ہیں۔ یہ عربی زبان کی پوری گرامر (صرف و نحو) نہیں، صرف مبادیات ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ جو حضرات عربی زبان سے ناواقف ہوں انہیں عربی الفاظ کی مختلف شکلوں اور عربی فقروں کی مختلف ترکیبوں سے کچھ شناسائی ہو جائے اور وہ اس طرح لغت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر آپ نے ان مبادیات کا غور سے مطالعہ کیا تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی مدد سے آپ عربی زبان سے کافی حد تک شناسا ہو جائیں گے۔

(۳) عربی زبان کے اصول کے مطابق لغت کی ترتیب الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ مادوں کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ مثلاً لفظ "متقین" آپ کو (م۔ث۔ق) کے تحت نہیں ملے گا۔ اس لفظ کے مادہ (و۔ق۔ی) کے ماتحت ملے گا۔ لیکن عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے یہ مشکل (بلکہ بعض اوقات ناممکن) ہوگا کہ وہ معلوم کر سکیں کہ فلاں لفظ کا مادہ کیا ہے اور جب وہ مادہ ہی معلوم نہیں کر سکینگے تو وہ اس لفظ کو لغت میں تلاش کیسے کر سکیں گے؟ اس دقت کے پیشِ نظر ہم نے تمام قرآنی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے اس فہرست کو حروفِ تہجی (ا۔ب۔ت۔ث) کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ اور ہر لفظ کے سامنے وہ مادہ دیدیا ہے جس کے ماتحت وہ لفظ

---

[1] آیات کے نمبروں کے لحاظ سے، ساری دنیا کے لئے قرآن کریم کے ایک اسٹینڈرڈ (STANDARD) نسخہ کی بڑی ضرورت ہے جو کتابت کی غلطیوں سے بھی بالکل پاک ہو۔

ملے گا۔ مثلاً فہرست میں لفظ "متقین" — م — کے ماتحت (بہ ترتیب م۔ت۔ق) دیا گیا ہے۔ اور اس کے سامنے لکھا گیا ہے — و۔ق۔ی — اس کے یہ معنی ہیں کہ لفظ "متقین" لغت میں "و۔ق۔ی" کے عنوان کے تحت ملے گا۔ یہ فہرست قریب ۵۰ صفحات سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ فہرست مکمل ہو۔ لیکن اس میں پھر بھی سہو و خطا کا امکان ہے۔ اگر آپ کو اس میں کوئی سہو یا تسامح نظر آئے تو اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں مناسب اصلاح کر لی جائے۔

مبادیات اور فہرست میں، کوشش بسیار کے باوجود چند ایک طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں انھیں فہرست کے آخر میں اغلاط نامہ میں درج کر دیا گیا ہے۔ آپ متعلقہ الفاظ کی تصحیح کر لیں۔

۱۶۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے اس لغت کی تدوین کا محرک جذبہ یہ تھا کہ جن حضرات کے دل میں قرآن کریم کا ذوق پیدا ہو چکا ہے وہ براہِ راست اسے سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ مقصد ایک بڑی حد تک زیرِ نظر لغت سے پورا ہو جانے کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن اکثر احباب کا خیال تھا (جس سے غور و فکر کے بعد مجھے بھی متفق ہونا پڑا) کہ اس کے باوجود (یا یوں کہیئے کہ اس کے ساتھ) قرآن کریم کے ایک رواں ترجمہ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے (اور صرف ابن قتیبہ ہی نے نہیں اب یورپ کے اکثر فضل مستشرقین بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ) قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا (اس کی تفصیل "مفہوم القرآن" میں ملے گی) یہ بالکل درست ہے۔ میرے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن نے خود مجھے بھی اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مشکل مسئلہ پر عرصہ تک غور کیا اور ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو ترجمہ اور تفسیر کے بین بین ہے۔ یہ کچھ اس سے ملتا جلتا ہے جسے انگریزی زبان میں (PARA = PHRASING) کہتے ہیں۔ اردو زبان میں اسے "مفہوم" کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی قرآن کا مفہوم اپنے الفاظ میں۔ میں نے قرآن کریم کے بعض مقامات کا مفہوم اس انداز سے متعین کیا اور اسے تجربۃً مختلف احباب کے سامنے پیش کیا۔ یہ تجربہ بڑا مفید رہا۔ ان کی رائے تھی کہ اس سے قرآن کریم کا مفہوم سمجھنے میں دقت نہیں رہتی۔ اس تجربہ کے بعد میں نے قرآنی الفاظ کے ان معانی کی رُو سے، جو زیرِ نظر لغت میں دیئے گئے ہیں، قرآن کریم کا مفہوم مرتب کیا اسی کا نام "مفہوم القرآن" ہے جو ابتدائی مسودہ کی شکل میں اس وقت موجود ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ زیرِ نظر لغت اور "مفہوم القرآن" کی اشاعت سے وہ دشواریاں دور ہو جائیں گی جو قرآن مجید کو سمجھنے میں عام طور پر لاحق ہوتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ (لغت نہیں تو کم از کم) مفہوم القرآن انگریزی زبان میں بھی شائع ہو جائے۔ تاکہ بیرونی دنیا (بالخصوص یورپ و امریکہ) خدا کی اس عظیم کتاب کو جو تمام نوعِ انسانی کی رہنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے براہِ راست سمجھ لے۔ اور اس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کا یہ دعویٰ کس قدر مبنی بر صداقت ہے کہ جو نظام اس نے عطا کیا ہے وہ نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا ہوں کہ مغربی ممالک اس نظام کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ لیکن یہ نظام ان کے سامنے نہیں آ رہا۔ یہ اسی صورت میں سامنے آئے گا جب قرآن کریم اس کی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

۱۷۔ لغت اور اس کے ساتھ مفہوم القرآن، سالہا سال کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے مرتب تو ہو گئے۔ لیکن اتنی ضخیم کتابوں

کے چھپوانے کی مجھ میں ہمت کہاں تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں میں بے بس تھا۔ میری تصانیف سے جو کچھ تھوڑا بہت منافع حاصل ہوتا ہے۔ وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں صرف ہو جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ اس کے لئے بھی کفایت نہیں کرتا۔ اس عظیم مشن کے متعدد گوشے ایسے ہیں جو سرمایہ کے نہ ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے۔ اس بے بسی نے مجھے عرصہ تک وقفِ اضطراب رکھا تا آنکہ میرے قرآنی احباب نے، جو میرے مشن سے متفق ہیں، از خود اس کا انتظام کر دیا۔ اور یوں میرے لئے اس دشوار گذار مرحلہ کو آسان بنا دیا۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور میرا دل ان احباب کے لئے جذبات تشکر و امتنان سے لبریز ہو رہا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ نہ شکریہ کے خواہاں ہیں، نہ ستائش کے متمنی —— قرآن کا رشتہ بھی دنیا میں عجیب رشتہ ہے۔

اس کے بعد طباعت کی عملی دشواریاں سامنے آئیں۔ آجکل لیتھو کی چھپائی جس بری طرح سے کتاب کو مسخ کر دیتی ہے اس کا مجھے تلخ تجربہ ہے۔ میں اس تجربہ کو، کم از کم لغت جیسی اہم کتاب کے سلسلہ میں دہرانے کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔ اوفسٹ کی چھپائی کی بابت معلوم کیا تو وہ ہماری بساط سے کہیں زیادہ تھی۔ اب لے دے کے ٹائپ کی چھپائی رہ جاتی تھی۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ ہمارے ہاں ابھی ایسا ٹائپ رائج نہیں ہوا جس کے ساتھ اعراب ہوں۔ اور اعراب الگ لگانے سے وہ اپنے صحیح مقام سے ادھر ادھر ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے لئے کئی ایک مطابع میں تجربے کئے گئے۔ ایک پریس میں مبادیات اور فہرست چھپوا کر بھی دیکھ لی گئی۔ تمام تگ و تاز کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ لغت کی طباعت کی اطمینان بخش صورت اسی نہج سے ہو سکتی ہے کہ پریس اپنے زیر اہتمام ہو۔ اس کے لئے کافی عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ بہرحال اب خدا خدا کر کے اس کا انتظام ہوا ہے اور میں اس قابل ہوا ہوں کہ لغت کی پہلی جلد احباب کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ اس کی طباعت اب بھی میرے معیار کے مطابق نہیں۔ (اس میں بھی بعض اوقات اعراب اپنے ٹھیک مقام پر نہیں لگ سکے)۔ لیکن میں نے اسے اس لئے گوارا کر لیا ہے کہ "معیار" کی تلاش میں، وقت کی اشد ضرورت کو بالآخر کب تک التوا میں ڈالا جا سکتا ہے؟ احباب کے تقاضوں کا تو یہ عالم ہے گویا —— سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا۔ اس لئے اپنی طرف سے جس قدر بھی اچھے سے اچھا ہو سکا، اسے چھاپ دیا گیا ہے۔

اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن، چار یا پانچ جلدوں میں تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد "مفہوم القرآن" کی طباعت کی باری آئے گی۔ "مفہوم القرآن" کے لئے بھی احباب کے تقاضے جس قدر شدید ہیں اس کا مجھے احساس ہے لیکن چونکہ اس مفہوم کی سند، صرف لغت زیر نظر میں مل سکے گی، اسلئے اسے لغت کی تکمیل سے پہلے شائع نہیں کیا جا سکتا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ صحیح ہے کہ زیر نظر لغت میں قرآنی آیات کا اردو ترجمہ لغوی مفہوم کی رعایت سے کر دیا گیا ہے۔ مفہوم القرآن کا انداز اس سے مختلف ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

۱۸۔ عام کتب لغت اس وقت مکمل ہوتی ہیں جب ان کی تمام جلدیں چھپ کر سامنے آ جائیں۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے زیر نظر لغت بھی اسی طرح مکمل ہوگا۔ لیکن یہ صرف لغت کی کتاب نہیں، اس میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات بھی دیئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کی ہر جلد اپنی اپنی جگہ مکمل اور خود مکتفی ہے۔ لہٰذا آپ اس کا انتظار نہ کیجئے کہ تمام جلدیں چھپ جائیں تو

اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ ہر جلد سے الگ الگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ آپ اسے لغات کی طرح نہ دیکھئے، کہ جب کسی خاص لفظ کے معانی معلوم کرنے ہوں تو کتاب کھول کر وہ معانی دیکھ لئے اور پھر کتاب رکھ دی۔ آپ اس کا مسلسل مطالعہ کیجئے اس طرح قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے جائیں گے۔

۱۹۔ اگرچہ لغت کا پورا مسودہ طباعت کے لئے تیار رکھا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ مزید غور و فکر سے بعض اہم چیزیں اُس وقت سامنے آئیں جب متعلقہ جلد چھپ چکی ہو یا قارئین کی طرف سے مفید مشورے، تجاویز یا وضاحت طلب امور سامنے آئیں۔ اگر ایسا ہوا تو آخری جلد کے ساتھ ایک تکملہ شائع کر دیا جائے گا جس میں یہ تمام امور آجائیں گے۔

۲۰۔ جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، میں اپنی کسی تحریر کو نہ سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں، نہ اُس موضوع پر حرفِ آخر۔ میری دیگر تصانیف کی طرح یہ لغت بھی بہر حال انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا امکان اور حک و اضافہ کی گنجائش ہے۔ احباب مجھے میری غلطیوں سے مطلع اور اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیں گے میں ان کا شکر گزار ہوں گا بشرطیکہ یہ بغرضِ تعاون ہو، نہ کہ بحث و جدل کی خاطر۔ میں بحث میں الجھا نہیں کرتا۔

اگر میری اس کوشش ناتمام سے کچھ احباب بھی قرآن کریم کو براہِ راست سمجھنے کے قابل ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ یہی میری زندگی کا مقصد اور یہی میری کاوشوں کا منتہیٰ ہے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

۲۵۔ بی۔ گلبرگ
لاہور (پاکستان)

غلام احمد پرویز
مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

نمونہ لغات

بعض احباب نے تجویز پیش کی ہے کہ اس تعارف کے ساتھ، اگر لغات کا کوئی ایک صفحہ بطور نمونہ شائع کر دیا جائے تو اس سے اس کے متن کے متعلق صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم نے جلد اوّل میں سے لفظ "اللہ" کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے متعلق لغات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ا ل ہ

اَلِهَ اِلَیْهِ یَاْلَهُ کے معنی ہیں گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا۔ نیز اَلِهَ کے معنی ہیں متحیر ہونا۔ اور اَلَهَ۔ یَاْلُهُ کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا۔ امان میں لینا۔ چنانچہ اَلِهَ بِالْمَکَانِ کے معنی ہیں امن و سکون سے کسی مکان میں سکونت اختیار کر لینا[1]۔ ان معانی کے اعتبار سے اِلٰهٌ کے معنی ہوں گے ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے جس سے مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصوّر سے انسان متحیر ہو جائے۔

بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ لفظ لَاهَ یَلِیْهُ سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں[2]۔

بعض کہتے ہیں کہ اَلَهَ کے معنی ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور اَلَّهَهُ کے معنی ہیں اس نے اسے غلام بنا لیا۔ اس سے تَاْلِیْهٌ کے معنی تَعْبِیْدٌ (غلام بنانا) آتے ہیں۔ اور اِلٰهٌ اسی سے ہے جو در اصل بمعنی مفعول مَاْلُوْهٌ ہے[3] (جیسے کِتَابٌ بمعنی مَکْتُوْبٌ ہے)۔ اس اعتبار سے اِلٰهٌ کے معنی ایسی ہستی ہوں گے جس کا غلبہ و اقتدار قبول کیا جائے۔ جس کے قانون کی اطاعت کی جائے۔ جس کے حکم کا اتباع کیا جائے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی تَعَبُّدٌ کے لکھے ہیں۔ یعنی کسی کی محکومیت اختیار کرنا۔ چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ (۲۶/۲۹) (اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو اِلٰہ تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا) تو وہاں اِلٰهٌ کے معنی صاحبِ اقتدار ہی کے ہیں۔ اسی طرح جہاں کہا گیا ہے اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۴۵/۲۳) "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیا" تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ اپنے جذبات ہی کے پیچھے پیچھے

---

[1] تاج [2] محیط۔ [3] عین۔

چلتا ہے۔ اُنہی کا اقتدار تسلیم کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کا بندہ بن چکا ہے۔ اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴)۔ وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی اِلٰہ ہے اور پستیوں میں بھی" (یا جو کائناتی اور معاشی دنیا میں اِلٰہ ہے)۔ تو اس کے معنی بھی صاحبِ اقتدار کے ہیں۔ یعنی کائنات میں بھی اقتدار و اختیار اسی کا ہے اور انسان کی معاشی اور معاشرتی دنیا میں بھی اسی کا۔

چونکہ توہم پرستی کے زمانہ میں لوگ چاند سورج وغیرہ کو بھی بڑی بڑی قوتوں کا مالک مان کر ان کی پرستش کرتے تھے اس لئے اِلٰهٌ کے معنی چاند ہیں اور اِلٰهَةٌ کے معنی سورج۔ اسی بنا سے ہر معبود کو اِلٰهٌ کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بتوں کو بھی جن کی پرستش کی جاتی ہے (۷/۱۳۸)

ایک خیال یہ ہے کہ اَللّٰهُ جامد لفظ ہے (کسی دوسرے لفظ سے نکلا نہیں) لیکن دوسرا خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ اَلْاِلٰهُ تھا (اَلْ + اِلٰهٌ)۔ کثرتِ استعمال سے اِلٰهٌ کا ہمزہ گر گیا اور پہلا لام دوسرے لام میں مدغم ہو گیا۔ اس طرح یہ لفظ "اَللّٰهُ" بن گیا۔[1]

قرآن کریم میں "اَللّٰهُ" خدا کی ذات کے لئے استعمال ہوا ہے۔ باقی تمام اَسْماء (نام) اس کی صفات ہیں۔

لہٰذا، اللہ، (قرآنی اِلٰهٌ) وہ بلند و بالا ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک متحیر رہ جاتے ہیں۔ جس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جس کی اطاعت نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہم اس کی اطاعت اس کے قانون کی رُو سے کر سکتے ہیں جو اس نے اپنی طرف سے (بذریعہ وحی) ہمیں دیا ہے (اور جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے)۔ لہٰذا اَطِیْعُوا اللّٰهَ کے معنی ہوں گے خدا کے قانون کی اطاعت کرو۔ اسی طرح کائنات میں بھی جو کچھ ہوتا ہے سب اسی کے قانون کے ماتحت ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ "اللہ یوں کرتا ہے" تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے قانون کے مطابق اس طرح ہوتا ہے۔ عالمِ امر میں بھی اسی کا قانون کارفرما ہے اور عالمِ خلق میں بھی یہ قوانین اس نے اپنی مشیت سے بنائے ہیں۔ اور اسی کی قدرت (کنٹرول۔ قبضہ۔ اختیار) سے یہ قوانین نافذ العمل اور کارفرما ہیں۔ یہی وہ سُنَّةُ اللّٰهِ ہے۔ جس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ (اس کی تفصیل ش۔ ی۔ ء کے عنوان میں دیکھئے)

تمام قرآن، اللہ تعالیٰ کی صفات، اس کے قوانین، احکام، حکمتِ بالغہ، ہدایات کا مجموعہ ہے۔ اس کی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اللہ کی وحدانیت ہے۔ یعنی اس حقیقت کا اعلان و ایمان کہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف اسی کا

---

[1] تاج

ہے۔ اس کے سوا کسی کا نہیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے، ہم اس کی ماہیت اور کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ محدود (FINITE) کسی لامحدود (INFINITE) کا ادراک نہیں کر سکتا۔ البتہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات (الاسماء الحسنیٰ) کا ذکر کیا ہے ہم ان سے خدا کے متعلق (اپنی حدود ذہنی کے اندر رہتے ہوئے) اندازہ کر سکتے ہیں۔ اللہ پر وہی ایمان قرآن کریم کی رُو سے صحیح ایمان ہے جو قرآن میں بیان کردہ صفات کے مطابق ہو۔ اس لئے دنیا میں جو لوگ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہیں انھیں قرآن کی رُو سے "اللہ پر ایمان رکھنے والے" نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بڑی اہم حقیقت ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ "خدا پرستی اور نیک عملی" وہی درست ہے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ نہ وہ جو مختلف افراد۔ قوم یا مذہب کے اپنے اپنے تصور کے مطابق ہو۔

یہ ہے اُس لُغات القرآن

کا تعارف جس کی پہلی جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ سفید کاغذ پر ٹائپ کے حروف موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے۔ ضخامت قریب پانسو صفحات۔ جلد نہایت مضبوط اور مُطلّا۔

قیمت۔ پندرہ روپے (محصول ڈاک ایک روپیہ)

اپنے لئے کتاب کا نسخہ جلد منگا لیجئے۔ اور اس کے بعد اپنا نام مستقل فہرست میں درج کرا لیجئے۔ تاکہ اگلی جلدوں کی اشاعت پر آپ کو فوراً اطلاع دی جا سکے۔

★ ——— ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

پرویز صاحب کی معرکہ آرا تصنیف

"انسان نے کیا سوچا؟"

پر پاکستان کے ممتاز اخبار "نوائے وقت" کا تبصرہ!

بڑی تقطیع کے کوئی ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل یہ عالمانہ، فاضلانہ اور حکیمانہ تصنیف علم، دین اسلام اور مطالعہ کی ایک بیش بہا خدمت ہے۔ اس کتاب میں نہایت جامع اور بھرپور پیرایہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ذہن انسانی اپنے لئے سچے مسلک کی تلاش میں کن کن مرحلوں سے گذرا ہے اور پھر اسلام، اس کے لئے واحد راہِ ہدایت کیسے قرار پایا۔ ... زیرِ نظر کتاب کو دیکھ کر مصنف کی وسعتِ مطالعہ، کاوشِ فکر، قدرتِ بیان اور سب سے بڑھ کر سلاستِ فکر و نظر کی داد دینا پڑتی ہے۔

آج کے دور میں جب علم وسیع ہے اور ہر موضوع کو علماء و محققین نے کھنگال کر ایک طالب علم کے سامنے معلومات کا سیلاب بہا رکھا ہے۔ تمام مکاتیبِ فکر کے سیر حاصل جائزہ اور اس کے نتیجے میں اسلام کی برتری کو منوالینا کمالِ تحقیق و علم ہے۔

فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ہی کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اندازِ تحریر ایسا سلجھا ہوا ہے کہ اسکی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ اسطرح انکی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دینِ حق سے قرب پیدا ہوگا۔ (نوائے وقت۔ ۲۸ مارچ سنہ ۶۰ء)

ٹائپ کی حسین طباعت — سفید کاغذ — جلد مضبوط — گرد پوش سے مزین

قیمت ——— "بارہ روپے"

ملنے کا پتہ:-

مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

پہلی دو جلدیں منظرِ اشاعت پر

(جدید ایڈیشن)

سلیم کے نام خطوط

از پرویز

زندگی کے اہم ترین مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں

پرویز صاحب کا دلنشین اندازِ تحریر

— طباعت حسین و جمیل ٹائپ میں —

قیمت جلد اوّل ——— آٹھ روپے

قیمت جلد دوم ——— چھ روپے

چند اہم عنوانات کی جھلکیاں

— جلد اوّل —

- ہماری نمازیں اور روزے کیوں بے نتیجہ ہیں؟
- ہمارے مذہبی اجتماعات
- اسلامی نظام کے بنیادی اصول
- کیا انسانی زندگی محض آب و گل کا کھیل ہے؟
- کمیونزم اور اسلام
- قرآنی نظامِ ربوبیت
- صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا مفہوم
- کیرکٹر کیسے پیدا ہوتا ہے؟
- غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

— جلد دوم —

- خدا کا تصور
- مقامِ محمدی
- کائنات کے دو عظیم انقلاب
- عید میلاد النبیؐ
- درود کا مفہوم
- جشنِ نزولِ قرآن
- فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟
- اسلامی شریعت کے مآخذ
- پاکستان میں قانون سازی کا اصول

ملنے کا پتہ :- مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔بی ——— لاہور

سلیم کے نام

(تصوّف، قرآن کی روشنی میں)

[تصوف کے موضوع پر، اس سے پہلے، سلیم کے نام دو خطوط شائع ہو چکے ہیں ـــــ ایک دسمبر ۵۴ء میں، جس کا عنوان "تصوّف" تھا۔ اور دوسرا ۹ اپریل ۱۹۵۵ء کے طلوع اسلام میں، جس کا عنوان "صوفیائے کرام" تھا۔ زیرِ نظر (تیسرا) خط اسی سلسلہ کی اگلی کڑی ہے۔ یہ تینوں خط "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں شائع ہو رہے ہیں جو اس وقت زیرِ طباعت ہے۔ طلوع اسلام]

اس سے پہلے دو خطوں میں سلیم! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تصوّف کی ابتدائی تاریخ کیا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کی کیا حالت تھی۔ اسلام نے اس کے خلاف کس طرح صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن اس کے بعد، یہ کس طرح مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو کر عینِ دین بلکہ "مغزِ دین" بن گیا۔ نیز یہ کہ ہمارے جلیل القدر صوفیائے کرام کے معتقدات کیا ہیں اور جو ملفوظات ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان کی رُو سے ان کے علم کے متعلق کیا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تمہارے آخری سوال کا جواب سامنے آتا ہے کہ جن اجزاء سے تصوّف مرکب ہے قرآن کی روشنی میں اس کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ اس کی رُو سے ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ مرحلہ ذرا دشوار گذار اور غور طلب ہے۔ اس لئے اس خط کو زیادہ توجّہ سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

علم کے ذرائع

اصل سوال تک پہنچنے سے پہلے تمہیداً ایک بات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی اور علم حاصل کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ طریقہ کیا ہے؟ مسائلِ زیرِ نظر پر غور و خوض کرنا۔ دوسروں کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنا ـــــ کتابوں کے ذریعے یا زبانی ـــــ فطرت کا مشاہدہ۔ تجربات کے ذریعے حقائق تک پہنچنا۔ اسی میں اقوامِ سابقہ کے تجربات بھی شامل ہیں جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ ذرائع ہیں جن کی رُو سے فراہم شدہ [illegible] (عقل و فکر سے) غور و تدبّر کرے تو اسے علم حاصل

ہوتا (یا اس کے علم میں اضافہ ہوتا) ہے۔ یہ طریقِ علم ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ اس میں جس قدر کوئی محنت کرے گا، اتنا ہی اس کا علم زیادہ ہوتا جائے گا۔

لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جو ان تمام ذرائع سے یکسر الگ اور منفرد ہے۔ وہ یہ کہ خدا کسی انسان کو براہِ راست حقائق کا علم عطا کر دے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں وحی کہا جاتا ہے اور یہ حضرات انبیاء کرامؑ سے مخصوص و مختص ہے[1]۔ یعنی خدا کی طرف سے اس طرح علم عطا ہونے کو وحی کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم عطا ہو اُسے نبی کہتے ہیں۔ بلا ذریعہ اور بلا واسطہ علم حاصل ہونے کی یہ استثناء (EXCEPTION) صرف نبی کے لئے ہے۔ غیر از نبی اس میں قطعاً شریک نہیں ہو سکتا۔ جس انسان (نبی) کو خدا کی طرف سے یہ علم ملتا ہے۔ اس میں اس کے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ (دیگر علوم کی طرح) اس علم کو (بھی) محنت اور ریاضت سے حاصل کرے یا اس میں اضافہ کر سکے۔ محنت اور ریاضت سے حاصل کرنا تو ایک طرف، اسے، وحی ملنے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسے وحی ملنے والی ہے۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ اسی طرح ہم نے تیری طرف (اے رسول) اپنے امر کو بذریعہ وحی نازل کیا۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴۲/۵۲)، تو جانتا نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ دوسرے مقام پر ہے وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (۲۸/۸۶)، تو اس کی امید ہی نہیں کر سکتا تھا کہ تیری طرف کتاب آئے گی۔ یہ صرف تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ تجھے وحی عطا ہوئی ہے)۔

وحی

وحی کا یہ سلسلہ حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ چلا آ رہا تھا تا آنکہ قرآن میں پیغامِ خداوندی کی تکمیل ہو گئی۔ اس نے وحی کے ذریعہ جو ہدایت انسانوں تک پہنچانی تھی وہ مکمل ہو گئی۔ اس میں نہ تغیر و تبدل کی ضرورت باقی رہی اور نہ حک و اضافہ کی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ تیرے رب کی باتیں صدق اور عدل کے ساتھ انجام تک پہنچ گئیں لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

ختمِ نبوت

سلسلۂ ہدایت تکمیل تک پہنچ گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)۔ "یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔" اس کے بعد خدا نے اعلان کیا کہ حضور نبی اکرمؐ خاتم النبیین ہیں (۳۳/۴۰)۔ آپ کی ذات پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا۔

سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو خاص ذریعۂ علم تھا (جس میں کسی انسان کو خدا کی طرف سے، عام ذرائع علم کے بغیر براہِ راست علم حاصل ہوتا تھا) اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے سلیم، کہ اگر (نبی اکرمؐ کے بعد) کوئی شخص اس کا

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ وحی کا لفظ قرآن میں اور معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن ہماری مراد اس علم سے ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے براہِ راست ملتا تھا۔

دعوےٰ کرے کہ اُسے خدا کی طرف سے براہِ راست علم عطا ہوتا ہے، تو وہ شخص نبوت کے بند دروازے کو کھولنے کا مدعی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے جس میں کسی التباس یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ اس کے بعد کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم مل سکے گا۔ اس میں (نبی اکرمؐ کے بعد) کسی شخص کی طرف وحی یا الہام کئے جانے کے امکان کا کوئی ذکر نہیں۔

لیکن تصوف کی ساری عمارت اس بنیاد پر اُٹھی ہے کہ (رسول اللہ کے بعد بھی) انسانوں کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوسکتا ہے (اور ہوتا ہے)۔ اس علم کو (وحی کے بجائے) الہام یا کشف کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم ملتا ہے اُسے (نبی کے بجائے) ولی یا صوفی کہتے ہیں۔ اس مختصر سی تشریح ہی سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ تصوف کا دعوےٰ، بالفاظِ دیگر نبوت کا دعوےٰ ہے۔ اس کا نام وحی کے بجائے الہام یا کشف۔ اور اس کے مدعی کا نام نبی کے بجائے ولی رکھ لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے یہ دعاوی تمہاری نظروں سے گذر چکے ہیں[1]۔

کشف و الہام

> جس مقام سے نبی لیتے تھے اس مقام سے انسانِ کامل۔ غوث۔ قطب لیتے ہیں۔۔۔۔۔ اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ایک طور پر مادۂ کشف والہام اور مادۂ وحیٔ رسول ایک ہے۔۔۔۔۔ صاحبِ کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقہ سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہے۔۔۔۔۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔۔۔۔۔ خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر انبیاء کو دیئے گئے تھے۔ (فصوص الحکم)

میں نہیں سمجھتا کہ ان تصریحات کے بعد، اس ضمن میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ دعوےٰ نبوت اور دعوائے الہام اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ (یہی وہ دروازہ تھا جس سے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نبوت کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے داخل ہوئے تھے) بعض لوگ کہتے ہیں کہ وحی اور الہام میں فرق یہ ہے کہ وحی کے ذریعے حاصل شدہ علم یقینی ہوتا ہے اور الہام کی رُو سے حاصل شدہ علم میں شک کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ محض اعتراض سے بچنے کے لئے ایک آڑ وضع کرلی گئی ہے۔ اس میں وزن کچھ نہیں۔ اگر الہام خدا کی طرف سے عطا شدہ علم ہے تو اس میں شک و شبہ کا کیا سوال؟ اور اگر اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے تو وہ علم خدا کی طرف سے عطا شدہ نہیں ہوسکتا۔ بعض کہہ دیتے ہیں کہ اُس علم میں تو شک و شبہ نہیں ہوتا لیکن صاحبِ الہام کو اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صاحبِ الہام کی ناپختگی کی دلیل ہے جب وہ پختگی کے مقام پر پہنچ جائے (جسے ابن عربی نے انسانِ کامل۔ یا غوث اور قطب سے تعبیر کیا ہے) تو وہ اپنے الہام کے سمجھنے میں بھی غلطی نہیں کرے گا۔ جب صورت یہ ہے کہ خدا اُسے "وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر انبیاء کو دیئے گئے تھے" تو اس قسم کا صاحبِ الہام یقیناً پختگی کے مقام تک پہنچا ہوا ہوگا۔ ورنہ ایسے شخص کو اس قسم کا علم دینے سے کیا حاصل جو اسے صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکے؟

---

[1] یہ تمام باتیں تفصیلاً اس سے پہلے ایک خط میں لکھی جاچکی ہیں جو طلوعِ اسلام بابت دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔

یہ تصوّر کہاں سے آیا؟ اب تم پوچھو گے کہ ہمارے ہاں یہ "کشف والہام" کا تصوّر آ کہاں سے گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں سے تصوّف کا تصوّر آیا وہیں سے کشف والہام کا تصوّر آ گیا۔ قرآن میں نہ یہ ہے نہ وہ۔ قرآن میں کشف کا لفظ ان معانی میں کہیں نہیں آیا۔ باقی رہا الہام۔ تو (ل۔ھ۔م) کے مادہ سے ایک جگہ لفظ اَلْھَمَھَا آیا ہے۔ سورۃ الشمس میں ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا۔ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا (۹۱/۷)۔ "لھم" کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے اندر کسی چیز کو رکھ دینا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ نفسِ انسانی اور وہ مؤثرات جو اسے سنوارنے اور اس کی تکمیل کرتے ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس کے اندر اس کا فجور اور اس کا تقویٰ رکھ دیئے گئے ہیں۔ یعنی اس کے بگڑنے اور بننے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ سارے قرآن میں یہی ایک مقام ہے جہاں اَلْھَمَ کا لفظ آیا ہے۔ اب اُس "الہام" سے کیا تعلق ہے جس پر تصوّف کی عمارت استوار ہوتی ہے؟

یاد رکھو سلیم! ختمِ نبوت کے بعد علمِ انسانی کا ذریعہ، عقل و فکر ہے۔ باقی رہا خدا کی طرف سے براہِ راست انکشافِ حقیقت، سو وہ قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اور قرآن غور و تدبّر سے سمجھ میں آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ختمِ نبوت کے بعد علم کے ذرائع ہیں، قرآن کریم اور فہم و تدبّر۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ کسی شخص کا یہ دعوے کہ اُسے خدا کی طرف سے براہِ راست حقائق کا علم عطا ہوتا ہے، دعوئے نبوت ہے۔ لیکن ایک پہلو سے دیکھئے تو اس قسم کا مدعی اپنے آپ کو انبیاء سے بھی اونچا لے جاتا ہے۔ انبیاء کی یہ کیفیت ہے کہ جب اللہ انہیں کسی حقیقت کا علم دے دیتا ہے تو وہ اُس علم کو پا لیتے ہیں۔ جب وہ وحی نازل نہیں کرتا تو یہ بے بس ہوتے ہیں۔ وحی کا لے آنا (یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل کر لینا) انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، تصوّف کا دعوے یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کسب و ہنر سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست علم حاصل کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی محنت سے اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ مستور حقائق کو بے نقاب دیکھ لے وہ اُس شخص سے (معاذ اللہ) یقیناً بلند درجے پر ہوتا ہے جو اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کی طرف وحی بھیجے تو اسے حقیقت کا علم ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! تصوّف کا دعوے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے!

غیب کا علم اب آگے بڑھو۔ تصوّف کا دوسرا دعوے (یا یوں سمجھو کہ پہلے دعوی کا فطری نتیجہ) یہ ہے کہ اس سے غیب کی باتوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ غیب کے علم کے متعلق قرآن کریم میں (بزبانِ نبی اکرمؐ) کہا گیا ہے کہ قُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ (۱۰/۲۰) "ان سے کہدے کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے"۔ دوسری جگہ ہے قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (۲۷/۶۵) "ان سے کہدو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو"۔ اور خود نبی اکرمؐ نے اس کا اعلان فرمایا کہ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۶/۵۰) "میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ ہی یہ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں"۔

قرآن کی ان تصریحات سے واضح ہے سلیم! کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو وحی کے

ذریعے بعض امورِ غیب کا علم دیدیتا ہے۔ سورہ الجن میں ہے عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا۔ خدا عالم الغیب ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیتا کہ کوئی شخص اس کے علمِ غیب پر قدرت (یا غلبہ) حاصل کرلے۔ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ... (۷۲/۲۶-۲۷) ہاں! جسے وہ رسول بنانا پسند کرے (تو اس کی طرف علومِ غیب کی وحی کر دیتا ہے)۔ مثلاً قرآن میں حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد فرمایا ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (۳/۴۴) یہ غیب کی باتیں ہیں جو تیری طرف وحی کی گئی ہیں"۔ (نیز ۱۱/۴۹ ؛ ۱۲/۱۰۲)

ان تصریحات سے ظاہر ہے سلیم! کہ اگر کوئی شخص غیب جاننے کا دعوےٰ کرتا ہے (پیش گوئیاں بھی اس میں داخل ہیں) تو وہ یا تو دعوےٰ نبوت کرتا ہے (کیونکہ قرآن کی رُو سے غیب کا علم اللہ کی طرف سے صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو دیا جاتا ہے) اور یا جھوٹ بولتا ہے (کیونکہ انبیاء کے علاوہ کسی اور کو غیب کا علم نہیں دیا جاتا)۔ اگر وہ دعوےٰ نبوت کرتا ہے، تب بھی وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ کے بعد بابِ نبوت بند ہو چکا ہے۔

خدا کو دیکھنا

اب اور آگے بڑھو۔ تصوّف کا دعوےٰ یہ ہے کہ صاحبِ کمال صوفی، خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شب اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے اور وہاں سے اپنے فیصلوں پر صاد کرا کر لاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ خدا سے جھگڑتا ہے اور اپنی بات منوا کر رہتا ہے۔ قرآن کی رُو سے یہ تمام دعاوی باطل ہیں۔ جہاں تک خدا کو دیکھنے کا تعلق ہے، قرآن کا ارشاد ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۶/۱۰۳) "نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں۔ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بڑا باریک بیں۔ باخبر ہے"۔ اور تو اور اگر کسی نبی کے دل میں بھی اس کی آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خدا کو دیکھ سکے تو اسے بھی کہدیا گیا کہ لَن تَرَانِي (۷/۱۴۳) "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی قرآن میں کہیں نہیں کہ حضورؐ نے خدا کو دیکھا تھا۔ قومِ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا جب کہا تھا کہ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً (۲/۵۵) "ہم تیری بات نہیں مانیں گے جب تک خدا کو کھلے بندوں نہیں دیکھ لیں گے"۔ اس تقاضے کے جواب میں جو کچھ ہوا قرآن اس پر شاہد ہے۔ ان حالات میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ ذاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔

معرفت

خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کی رُو سے تصوّف کا مطالبہ ایمان کا نہیں، عرفان (معرفت) کا ہے۔ یعنی خدا کو ماننا نہیں بلکہ خدا کو پہچاننا۔ خدا کو پہچاننے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم کائنات (اور قرآن کریم) پر غور و تدبر سے خدا کی خلاقیت اور دیگر صفات کا علیٰ وجہ البصیرت اندازہ کریں اور اس طرح "خدا کو پہچانیں"۔ اس فکری طریق سے خدا کے متعلق اندازہ کرنے میں بھی انسان غلطی کر سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ایسے لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ (۶/۹۱)۔ انہوں نے خدا کے متعلق ویسا اندازہ نہیں لگایا جیسا اندازہ لگانے کا حق تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے متعلق جو کچھ بتانا تھا اسے وحی کے ذریعہ (قرآن

کریم میں) بتا دیا۔ اس میں بھی اُس نے صرف اپنی صفات کے متعلق بتایا ہے۔ خود ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا ذہنِ انسانی کے لئے ناممکن ہے۔ محدود ادراک لامحدود کے کنہ و حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے ذاتِ خداوندی پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے عرفان کا مطالبہ کہیں نہیں کیا۔ اور تو اور خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ حضورؐ نے خدا کی "معرفت" حاصل کر لی تھی۔ اس کی ذات کا اِدراک تو ایک طرف، اُسے کسی مثال سے بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲/۱۱) خود خدا کا ارشاد ہے۔ علاوہ بریں، اس نے اپنی جو صفات بیان کی ہیں، ان کے علاوہ اگر انسان اپنے ذہن سے اس کی کوئی اور کوئی صفت بیان کرنا چاہے تو قرآن اسے بھی صحیح قرار نہیں دے سکتا۔ اور کہہ دیتا ہے کہ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (۶/۱۰۰ و دیگر مقامات)۔ "لوگ جو کچھ اس کے متعلق کہتے ہیں وہ اس سے بلند اور پاک ہے"۔ لہٰذا جس خدا کی کیفیت ہو اس کے متعلق یہ دعوےٰ کہ ہم ذاتِ خداوندی کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں، قرآن کی تعلیم کے یکسر منافی ہے۔ انسان، نہ خدا کی ذات کا مشاہدہ کر سکتا ہے نہ (ان معنوں میں) اس کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

مرادیں پوری کرنا

تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا سلیم! کہ پیروں فقیروں کے گرد اس قدر ہجوم کیوں رہتا ہے؟ اس لئے کہ یہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں! یہ جس سے بگڑ جاتے ہیں اسے تباہ کر دیتے ہیں جس سے خوش ہو جاتے ہیں اُس کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ یہ لوگوں کو اولاد دیتے ہیں۔ دولت بخشتے ہیں۔ شفاعت عطا کرتے ہیں۔ مناصب و مراتب دلاتے ہیں۔ مقدمات ان کے حق میں فیصل کراتے ہیں۔ ان کے دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ غرضیکہ ان سب کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی کو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ نفع اور نقصان کے لئے اللہ نے محکم اور اٹل قوانین اور اسباب مقرر کر رکھے ہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نفع یا نقصان ان اسباب کے ذریعے ہی پہنچا سکتا ہے۔ ان سے الگ ہٹ کر کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور تو اور خود نبی اکرمؐ سے کہلوا دیا گیا کہ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۷۲/۲۱)۔ "ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے لئے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا"۔ دوسروں کے لئے تو ایک طرف، خود اپنی ذات کے لئے بھی نہیں۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ "ان سے کہہ دو کہ میں اپنے آپ کے لئے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (۷/۱۸۸)۔ "میں اگر غیب جانتا تو اپنے لئے دنیا بھر کے مفاد جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو بھی نہ سکتی"۔ لیکن مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے جن میں کوئی شخص تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی ان کے نتائج کو روک سکتا ہے۔

میں نے تمہیں بتایا تھا سلیم! کہ علمائے عمرانیات کی تحقیق کی رُو سے، انسان پر پہلا دور یہ آیا تھا کہ وہ جب کسی بڑی قوت سے ڈرتا تو اس کے سامنے گڑگڑانے لگ جاتا، ہاتھ جوڑتا، پاؤں پڑتا، منت و خوشامد کرتا اور اس طرح اسے راضی کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے

عہدِ پرستش (AGE OF WORSHIP) کہتے ہیں (یاد رکھو اسلیم۔ یہ گفتگو اُس انسان کے متعلق ہو رہی ہے جس تک وحی کی روشنی نہیں پہنچی تھی)۔ اس کے بعد ان میں کچھ سیانے پیدا ہو گئے جنھوں نے ان سے کہا کہ ان بڑی قوتوں سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں ایسے طریقے بتلاتے ہیں جن سے یہ قوتیں مجبور ہو کر تمہاری مرضی کے مطابق کام کرنے لگ جائیں۔ اس کے لئے انھوں نے جنتر منتر۔ گنڈے تعویذ۔ ٹونے ٹوٹکے چلّے مراقبے۔ وغیرہ ایجاد کئے۔ اسے عصرِ سحر (AGE OF MAGIC) کہتے ہیں۔ تصوف اسی "عصرِ سحر" کی یادگار ہے۔ اس میں سمجھایا جاتا ہے کہ ایک "ولی اللہ" میں اس کی قوت ہوتی ہے کہ وہ خدا کے قانون کے خلاف جو کچھ چاہے کر دے۔ یہی عقیدہ لوگوں کو ان کے گرد جمع کرتا اور ان سے سجدے کراتا ہے۔

عصرِ سحر

مُردوں کی پرستش

پیروں فقیروں کی اس قوت اور اختیار کے متعلق اتنا ہی نہیں سمجھا جاتا کہ وہ ان کی زندگی تک محدود ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے اختیارات کی وسعتیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں اور ان کی قبریں مرجعِ انام بن جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ قائم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے تمام حالات سے باخبر ہیں۔ ہماری سب باتیں سنتے ہیں اور دلوں کے حالات تک سے واقف ہیں۔ ہماری فریاد سنتے ہیں اور مدد بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ۔ اور اگر وہ تمہاری پکار سن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہ دے سکتے۔ (۳۵/۱۴) وہ تمہاری کیا سنیں گے انھیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم و شعور نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۲۱/۱۶)

یہ ہے سلیم! قرآن کی رُو سے (زندہ اور مُردہ) "پیروں فقیروں" کے اختیارات کا عام جائزہ کہ متعلق تصوف کی رُو سے عقیدہ ہے کہ خدا کے حکم، قضا و قدر پر انہی کا تصرف ہوتا ہے اور زمین کے اوپر جس قدر (زندہ) مخلوق بستی ہے ان کے تمام معاملات کا فیصلہ زیرِ زمین بسنے والی (مُردہ) دنیا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ تم نے "مُردہ بدست زندہ" کا محاورہ سنا ہوگا۔ لیکن تصوف میں اس کے الٹ ہوتا ہے۔ وہاں کا قانون یہ ہے کہ "زندہ بدست مُردہ"۔

اولیاء اللہ

تصوف کی رُو سے اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ مانا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیات عام جماعتِ مومنین سے مختلف ہوتی ہیں اور ان کی پہچان کے طریقے بھی الگ ہوتے ہیں۔ یہ تصور بھی قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم مومنین کو ہی "اولیاء اللہ" (اللہ کے فرمانبردار بندے۔ یا اللہ کے دوست) کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ اللہ کے فرمانبردار بندے، اس کے دوست، وہ ہیں جن پر نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ حزن اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۲) (یہ کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا) یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی سلیم! کہ اولیاء اللہ، مومنین اور متقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔

تصوّف کی رُو سے "اولیاء اللہ" کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یہ دنیا، دنیا داروں کے لئے ہوتی ہے۔ "اللہ والوں" کی دنیا، روحانی دنیا ہوتی ہے۔ "اللہ والے" اس دنیا میں غریب و محتاج، بیکس و بے بس، مفلوک الحال، خراب

اولیاء اللہ کی زندگی

و خستہ رہتے ہیں، شکستہ جھونپڑی، پھٹے ہوئے کپڑے، ایک مٹکا، ایک پیالہ، ایک کشکول، یہ کل متاعِ حیات۔ لیکن اپنی روحانی دنیا کے بادشاہ۔ قرآن اس کے برعکس کہتا ہے کہ اولیاء اللہ کی نشانی یہ ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبریاں اور خوشحالیاں ہیں۔ اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اس کے بعد ہے لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اللہ کی ان باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یعنی "اولیاء اللہ" کی اس دنیا کی زندگی کو نہایت شگفتہ و شاداب ہونا چاہیئے۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰/۶۴) یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن کی رُو سے

(۱) اولیاء اللہ کی کوئی الگ جماعت نہیں ہوتی۔

(۲) مومنین ہی کو اولیاء اللہ کہتا ہے

(۳) ان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان کی اس دنیا کی زندگی بڑی شگفتہ و شاداب ہوتی ہے۔

(اس نکتہ کی مزید وضاحت ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی۔)

تصوف کا دعوےٰ یہ ہے کہ جو طریق اس نے تجویز کیا ہے اس سے انسان کا "تزکیۂ نفس" ہو جاتا ہے۔ پہلے تم اس اصطلاح کا

تزکیۂ نفس

مفہوم سمجھ لو۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روح خدا کی ذات کا ایک حصّہ ہے جو اپنے اصل سے الگ ہو کر مادہ کے دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اسے ان آلائشوں سے پاک و صاف کرنا، تاکہ یہ اپنی اصل سے جا کر مل جائے، مقصودِ حیات ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک "تزکیہ" کے معنی ہیں انسانی روح کو مادی آلائشوں سے پاک کرنا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھو سلیم! کہ انسانی روح کے متعلق یہ تصوّر (کہ وہ ذاتِ خداوندی کا حصّہ ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادی غلاظتوں سے ملوّث ہو چکی ہے) کس قدر قرآن کے خلاف ہے؟ ذات (PERSONALITY) انسان کی ہو یا خدا کی، ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE WHOLE) ہوتی ہے جس کے حصّے بخرے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ کہنا یکسر خلافِ حقیقت ہے (اور قرآن سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی) کہ انسانی روح، ذاتِ خداوندی کا حصّہ ہے۔

پھر مادہ (MATTER) کو اس قدر غلیظ اور قابلِ نفرت سمجھنا۔ قرآنی تعلیم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ قرآن اس ذہنیت

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے

اور تصوّر کو کفر سے تعبیر کرتا ہے وہ مادی کائنات کے متعلق کہتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ کائنات کی پستیوں اور

ملندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل نہیں پیدا کیا۔" یعنی اس کا قابلِ نفرت (غلیظ اور ناپاک) ہونا تو ایک طرف یہ بے کار اور رائگاں بھی نہیں۔ ذَالِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہ ان لوگوں کا ظن ہے جو کفر کرتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) "سو جو لوگ (اس طرح) کفر کرتے ہیں جہنم کی آگ کی وجہ سے ان کی تباہی ہے۔" تم نے غور کیا سلیم! قرآن نے کیا بات کہی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے جو لوگ اس مادی دنیا کو باطل سمجھتے ہیں۔ وہ مومن نہیں کافر ہیں ـــــ اور تصوف کی بنیاد ہی اس تصور پر ہے کہ دنیا باطل ہے۔ اس سے دور بھاگنا اور روح کو اس کی آلائشوں سے پاک و صاف کرنا مقصودِ زندگی ہے۔

تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم

"تزکیۂ نفس" کے معنی انسانی ذات کو مادی آلائشوں سے پاک اور صاف کرنا نہیں۔ اس کے معنی انسانی ذات کی نشوونما (GROWTH OR DEVELOPMENT) ہیں۔ قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود وہی، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ یہ نشوونما، مال و دولت سے نفرت کر کے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی رُو سے اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان انتہائی محنت سے مال و دولت کمائے اور پھر اسے دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے عام کر دے۔ سورۃ والّیل میں ہے کہ جہنم کے عذاب سے محفوظ وہ رہے گا اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸) جو اپنے مال کو (بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی سب کچھ) دوسروں کی پرورش کے لئے دے دے تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما (تزکیہ) ہو جائے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن کی رُو سے تزکیۂ نفس کا طریقہ کیا ہے۔ کما کر دوسروں کی پرورش کے لئے عام کرنا۔ نہ یہ کہ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنا۔ جو شخص اپنے آپ کو فقیر (صوفی) کہتا ہے، وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار جَو کی روٹی ہی کیوں نہ کھائے، وہ ہوتی تو دوسروں کی کمائی کی ہے۔ یہ چیز دنیا سے نفرت کرنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان مال و دولت نہ کمائے۔ بہرحال یہ ہے "تزکیۂ نفس" کا وہ مفہوم اور وہ طریقہ جو قرآن نے بتایا ہے اور وہ ہے وہ مفہوم اور وہ طریقہ جو تصوف کے ہاں ملتا ہے۔ فرق ان دونوں کا تمہارے سامنے ہے۔ سب سے بڑی چیز یہ تصوف رہبانیت کی زندگی سکھاتا ہے۔ یعنی انفرادی زندگی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تصورِ حیات، عیسائی راہبوں کا خود وضع کردہ ہے۔ خدا کا تعین کردہ نہیں (۵۷/۲۷)۔

اجتماعی زندگی

خدا نے جماعتِ مومنین کو "امت" بنا دیا ہے (۲/۱۴۳)۔ انھیں اجتماعی زندگی کے طور طریق سکھائے ہیں۔ ان سے تاکید کی ہے کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹) میری جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو انفرادی زندگی مت بسر کرو۔ میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر اجتماعی زندگی بسر کرو۔ اس سے تم جنت میں جانے کے قابل ہو سکو گے ـــــ اس دنیا میں بھی، اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی ـــــ لہٰذا تزکیۂ نفس انفرادی زندگی سے نہیں ہوتا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرے اور اس طرح تمام افراد کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔

اب سلیم! تم تصوف کے اُس گوشے کی طرف آؤ جو اس کی اصل و بنیاد ہے۔ اس گوشے کو سمجھنے کے لئے اُس کہانی کو یاد کرو جو

میں نے پچھلی گرمیوں میں تمہیں سنائی تھی اور جو دبستانِ تصوف میں داخل ہونے والے "طالب علم" کو پہلے دن یاد کرائی جاتی ہے

وسیلہ

کہانی یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے صاحبِ کمال۔ اور ایک تھا ان کا مرید۔ یہ دونوں دریا کے اِس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اُس پار تھی۔ یہ ہر روز صبح اٹھتے اور خانقاہ کا رخ کر لیتے۔ آگے آگے پیر۔ پیچھے پیچھے ان کا مرید۔ جہاں سے انھوں نے دریا پار کرنا ہوتا تھا وہاں نہ پل تھا نہ کشتی۔ لیکن پیر صاحب لبِ دریا آتے اور رواں دواں دریا پر چلتے چلے جاتے (جیسے سڑک پر چل رہے ہیں) ان کے پیچھے پیچھے ان کا مرید بھی دریا پر گامزن ہو جاتا۔ اس لئے کہ انھوں نے اُسے بتا رکھا تھا کہ جب دریا آئے تو تم نے میرا نام لے کر پانی پر قدم رکھ دینا۔ اور جب تک اُس پار نہ پہونچ جاؤ میرا نام لیتے چلے جانا۔ برسوں اسی طرح گذر گئے۔ صبح دریا کو اِدھر سے اُدھر اور شام کو اُدھر سے اِدھر پار کر لیتے ــــ آگے آگے پیر۔ پیچھے پیچھے پیر کا نام جپتے ہوئے مُرید۔

ایک دن عین دریا کے بیچ میں پہنچکر پیر صاحب نے دیکھا کہ ان کا مرید ان کے پیچھے پانی میں غوطے کھا رہا ہے اور چلّا رہا ہے کہ یا حضرت بچائیے۔ انھوں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور دریا پار لے گئے۔ وہاں جا کر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا جو تم ڈوبنے لگے تھے؟ اس نے دست بستہ کہا کہ حضور! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ میں ہر روز دیکھتا تھا کہ آپ بھی میرے آگے آگے منہ میں کچھ کہتے رہتے ہیں۔ آج میں نے ذرا آگے بڑھ کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے "یا اللہ! یا اللہ!!" میں نے سوچا کہ جب آپ اللہ کا نام لے کر پار اترتے ہیں تو میں آپ کا نام کیوں لوں! چنانچہ میں نے آپ کے نام کی جگہ "یا اللہ! یا اللہ!!" کہا اور گڑم سے پانی کے اندر پہونچ گیا۔

پیر صاحب مسکرائے اور کہا کہ تو نے کبھی اللہ میاں کو دیکھا ہے؟ اس سے کچھ جان پہچان ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں یا حضرت! میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میری اس سے جان پہچان نہیں۔ پیر صاحب نے کہا کہ بھائی! جس سے جان پہچان نہ ہو وہ تمہارے بلانے پر تمہاری مدد کو کس طرح آسکتا ہے؟ میری اس سے جان پہچان ہے میں اُسے بلاتا ہوں تمہاری ..... مجھ سے جان پہچان ہے تم مجھے پکارو۔ کرتا تو سب کچھ وہی ہے لیکن اس تک مرشد کے وسیلے سے پہنچا جاتا ہے۔ تم دوپہر کے وقت سورج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ کبھی سورج کو نہیں دیکھ سکو گے۔ آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ لیکن پانی کا پیالہ لے کر اس میں سورج کو دیکھو وہ پورے کا پورا نظر آجائے گا[1] تمہاری آنکھیں اللہ کے جلال کیے نقاب برداشت نہیں کر سکتیں۔ تم اسے مرشد کے آئینہ میں سے ہی دیکھ سکتے ہو۔ براہِ راست کوئی خدا تک نہیں پہونچ سکتا۔ خود خدا نے حکم دیا ہے کہ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔ اس کی طرف (جانے کے لئے) وسیلہ تلاش کرو۔ تم بغیر وسیلہ کے اس تک کیسے پہنچ سکتے ہو؟

سنا تم نے سلیم! اس کہانی کو۔ اور پھر "سورج اور پانی کے پیالے" کی مثال کو! حقیقت یہ ہے کہ تصوف کا سارا

---

[1] حالانکہ اس طرح بھی آنکھوں میں اس کی چمک پڑتی ہے۔ اور انسان اسے پوری طرح نہیں دیکھ سکتا

تمثیلات دارومدار اسی قسم کی تمثیلات پر ہے۔ ان کی ساری تعلیم تمثیلات کے رنگ میں دی جاتی ہے۔ ایک مثال بیان کرتے ہیں اور پھر جھٹ سے اپنی تعلیم کا ایک ٹکڑا اس سے چسپاں کر کے، مرید سادہ لوح کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ان کی مثال یا تشبیہ ایسی برجستہ ہوتی ہے کہ وہ دماغ میں چپک جاتی ہے اور انسان سمجھنے لگتا ہے کہ انھوں نے بہت بڑی حقیقت بیان کر دی۔ مثلاً انھوں نے بتانا ہے کہ جب تک تجلیاتِ خداوندی قلبِ مرشد کے اندر سے نہ گذریں شعلۂ عشق بیدار نہیں ہو سکتا۔ اسے وہ اس طرح بیان کریں گے کہ سورج کے سامنے روئی کا ڈھیر دن بھر پڑا رہنے دو۔ وہ یونہی ذرا سا گرم تو ہو جائے گا اس میں آگ نہیں لگے گی۔ لیکن سورج کی انہی کرنوں کو آتشیں شیشے میں سے گذارو۔ دو منٹ میں روئی میں آگ لگ جائے گی۔ کسی سے کہو کہ آتشیں شیشے کے بغیر ساری عمر میں روئی میں آگ لگا کر دکھائے ـــــ یہ ہے سلیم! ان کا طریقۂ تعلیم۔ یہ طریقہ محض شاعری ہے۔ حقیقت نگاری نہیں۔ یہ لطائف ہیں۔ حقائق نہیں۔ تصوف کا سارا دارومدار شاعری پر ہے ـــــ خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں ـــــ اور قرآن شاعری کو آسمانی انقلاب کے داعی کے شایانِ شان قرار نہیں دیتا۔

لیکن ان کے طریقۂ تعلیم میں سب سے خطرناک مقام وہ ہوتا ہے جہاں وہ اس قسم کی شاعری کی تائید میں قرآن کی آیات پیش کر دیتے ہیں۔ جیسے مندرجہ بالا مثال میں وسیلہ کے متعلق آیت پیش کی گئی ہے۔ تم مثالوں کو چھوڑو اور اس آیت کو لو۔ یہ سورۂ مائدہ کی آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ. وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. (۵/۳۵)

وسیلہ کی آیت اس کا صاف اور سیدھے الفاظ میں ترجمہ ہے ـــــ اے ایمان والو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ اختیار کرو)۔ اور اس کا وسیلہ طلب کرو۔ اور اس کے راستے میں جہاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اس سے یہ حضرات "خدا تک پہنچنے کے لئے وسیلے" کی قرآنی سند لاتے ہیں۔ لیکن سلیم! تم یہ سنکر حیران ہو گے کہ ہم جن معنوں میں (اردو میں) وسیلہ کا لفظ بولتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ عربی زبان میں اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ـــــ قدر و منزلت۔ عزت و تکریم۔ مدارج و مراتب۔ قرب ـــــ اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین سے کہا ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس طرح اس کے ہاں عزت و مرتبت کی طلب کرو۔ اس کے لئے اس کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ ہے وہ طریق جس سے تم اللہ کے نزدیک واجب التکریم ہو جاؤ گے۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹/۱۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی تم میں سے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہو گا وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہو گا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا تھی اور یہ حضرات اسے پیش کس طرح کرتے ہیں؟ قرآن دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ یہ بڑے بڑے بزرگ جنھیں لوگ خدا تک پہنچنے کا "وسیلہ" سمجھتے ہیں خود ان کی یہ حالت ہے کہ وہ بھی خدا کے ہاں اپنی قدر و منزلت کے آرزومند رہتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ. وَيَرْجُونَ

رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ. اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۱۷/۵۷) "جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ وہ اپنے رب کے ہاں عزت و مرتبہ ڈھونڈھتے ہیں ـــــ وہ بھی جو ان میں سے سب سے زیادہ قریب ہے ـــــ وہ خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اس کا عذاب واقعی ایسا ہے جس سے ڈرا جائے۔" تم غور کرو سلیم! کہ جب بڑے بڑوں کی تو یہ شانِ خداوندی کے سامنے حالت یہ ہے تو اُس تک پہنچنے کا "وسیلہ" کون بن سکتا ہے؟

قربِ خداوندی

قرآن کہتا ہے کہ مشرکین جو خدا کے علاوہ اور معبودوں کی بھی پرستش کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ان معبودوں کی پرستش مقصود بالذات نہیں۔ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں۔ یعنی ہم قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں (مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۳۹/۳). تم غور کرو سلیم! کیا بعینہٖ یہی جواب ان حضرات کی طرف سے نہیں ملتا جو پیر کو خدا تک پہنچنے کا "وسیلہ" قرار دیتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس تک انسان براہِ راست نہیں پہنچ سکتا، بلکہ کسی کی وساطت سے پہنچ سکتا ہے ذہنِ انسانی کے اُس دَور کا پیدا کردہ ہے جس میں خدا کو "بادشاہ" جیسا سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح آپ کسی بادشاہ (یا حاکم) تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتے بلکہ ان لوگوں کے ذریعے ہی پہنچ سکتے ہیں جو اُس کے مقرب ہوں۔ اسی طرح خدا کے متعلق بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ نہ اس تک براہِ راست پہنچا جا سکتا ہے نہ اس تک اپنی فریاد پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ان لوگوں کا ذریعہ تلاش کرے جو "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" ہیں۔

خدا براہِ راست سنتا ہے

قرآن کی رُو سے خدا کے متعلق ایسا عقیدہ اور تصور یکسر باطل ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ. جب تجھ سے میرے بندے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں (ان سے) قریب ہوں۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (اتنا قریب) جب بھی کوئی بلانے والا مجھے بلاتا ہے تو میں اس کے بلانے کا جواب دیتا ہوں۔ (۲/۱۸۶) قرآن کے اس واضح اعلان سے ظاہر ہے کہ خدا ہر بندے کی پکار کو براہِ راست سنتا ہے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ کہ خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی وسیلہ یا ذریعہ کی ضرورت ہے، قرآن کے اس اعلان کی تکذیب ہے کہ وہ اتنا قریب ہے کہ اس کا ارشاد ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶). "ہم انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔ اب ظاہر ہے کہ جو ذات انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہو اور اس کا اعلان ہو کہ ہم ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتے ہیں۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس تک آواز پہنچانے (یا اس تک پہنچنے) کے لئے کسی ذریعے اور وسیلے کی ضرورت ہے۔ خدا کے ارشاد کے منافی ہے۔

اس مقام پر سلیم! یہ خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جب خدا ہر ایک کی سنتا ہے تو پھر ہر ایک کی مانگ (طلب) پوری کیوں نہیں ہو جاتی؟ اس سوال کا مفصل جواب تو تمہیں میری کتاب "من و یزدان" کے عنوان "مشیت۔ تقدیر۔ دعا" میں ملیگا

(جس کا ملخص میں اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں[1]) لیکن مختصر جواب قرآن نے اسی آیت کے باقی ماندہ حصے میں دے دیا ہے وہاں کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مانگ پوری کردں تو اس کا طریق یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (۲/۱۸۶) انھیں چاہیئے کہ پہلے میری (دعوت پر لبیک کہیں میرے قوانین کی اطاعت کریں۔ انھیں اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ اس سے ان کے سامنے وہ راستہ آجائے گا جو انھیں ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ انھیں اس مقصد کے لئے کسی "مرشد" کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کریں جو قوانینِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہو۔ پھر ان کی ہر طلب (جو لامحالہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہی ہوگی) اُس معاشرہ کی وساطت سے پوری ہوتی جائے گی۔

خدا کیسے سنتا ہے؟

یہ ہے سلیم! وہ طریقہ جس سے ہر فرد اپنی آواز خدا تک پہنچا سکتا ہے اور خدا اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اُس معاشرہ کے اندر ہوتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ نہ کہ خالقانیت کی انفرادی زندگی سے جس کے متعلق خود قرآن نے کہہ دیا ہے کہ وہ انسانوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ خدا کا مقرر فرمودہ نہیں۔ (۵۷/۲۷)

اس مقام پر سلیم! اتنا اور بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جسے "قربِ خداوندی" کہتے ہیں اس سے مراد کیا ہے؟ اور "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" سے کون لوگ مراد ہیں؟ جب خدا کا تصور "بادشاہ" کا سا قائم کر لیا جائے تو اس سے "مقربین" سے مفہوم ایسے لوگ ہوں گے جو خدا کے قریب ہوں۔ جو خدا کے راز داں ہوں۔ خدا ان سے صلاح و مشورہ کرتا ہو۔ وہ خدا سے لوگوں کی سفارش کرتے ہوں۔ لیکن خدا کے اس تصور کی رو سے جسے قرآن پیش کرتا ہے یہ تمام نظریات باطل قرار پاتے ہیں۔ اس تصور کی رو سے قربِ خداوندی کا مفہوم کچھ اور ہے اسے غور سے سنو۔

قربِ خداوندی کا مفہوم

جو انسان قوانینِ خداوندی کی اتباع کرتا ہے۔ اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ "ذات کی نشوونما" کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اس سے انسان کے اندر حدودِ بشریت کے مطابق خدائی صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے۔ اسی کو قربِ خداوندی کہتے ہیں یعنی جس انسان میں جس قدر صفاتِ خداوندی کی نمود ہوگی وہ اُسی قدر خدا کا مقرب ہوگا۔ اس سے صرف اس کی اپنی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ "خدا کا مقرب" بن کر کاروبارِ خداوندی میں دخیل ہو جاتا ہے اور "خدا اور بندوں" کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے۔ کوئی "مقرب" نہ خدا کا مشیر ہوتا ہے اور نہ ہی خدا تک بندوں کی سفارشیں پہنچاتا ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے ایسے مقرب ہوں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اولیاء اللہ" (یعنی جنھیں تصوف کی اصطلاح میں اولیاء کہا جاتا ہے) خدا سے محبت کرتے ہیں اور

---

[1] وہ خط جس کا عنوان ہے "خدا کا تصور"

خدا سے محبت کا مفہوم

ان کی محبت، عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو عشقِ خداوندی کی آگ میں اس شدّت سے جلاتے ہیں کہ وہ خود آگ بن جاتے ہیں، جس طرح لوہا آگ میں تپانے سے آگ بن جاتا ہے۔

یہ سب شاعری ہے سلیم! اور اُسی تمثیلی اندازِ بیان کا نتیجہ جس پر تصوّف کی بنیاد ہے۔ خدا نے کہیں نہیں کہا کہ انسان کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عشقِ خداوندی کی آگ میں جلا کر خود آگ بن جائے۔ اس سلسلہ میں اہلِ تصوّف کی طرف سے قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے۔ یعنی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (2/165)۔ اس کا عام الفاظ میں ترجمہ یہ ہے کہ "ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو خدا کے علاوہ اور قوتوں کو اس کا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت بڑھ کر ہیں"۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی اس آیت سے بھی "خدا سے محبت" کی دلیل لائی جاتی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (3/31-32) اس کا ترجمہ عام الفاظ میں یہ ہے۔ "ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اِتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصوروں کو معاف کر دے گا۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا۔ رحم کرنے والا ہے ان سے کہدو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا"۔

قبل اس کے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ عربی زبان میں لفظ "محبت" کے معنی کیا ہیں۔ تم یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ لوگے کہ

غیر مرئی سے محبت ناممکن ہے

خدا کی ذات انسانی حیطۂ ادراک سے بالا ہے۔ اس لئے جس قسم کی محبت انسانی محبوبات کی جاتی ہے (خواہ وہ اولاد سے محبت ہی کیوں نہ ہو) اس قسم کی محبت خدا سے کی ہی نہیں جا سکتی۔ تم کسی اَن دیکھی چیز سے محبت کر ہی نہیں سکتے۔ یہی وہ نفسیاتی دشواری تھی جس کی وجہ سے (محسوسات کے خوگر انسان کو) خدا کو انسانی شکل (اوتاروں کے روپ) میں ڈھالنا پڑا۔ اس کی مورتیاں بنانی پڑیں۔ اور یہی وہ مشکل تھی جس کے پیشِ نظر خود ہمارے تصوّف میں "مجاز سے حقیقت" کی طرف جانے کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اور مضطرب و بے قرار عاشق کی جبینِ نیاز میں تڑپنے والے سجدوں کو کہنا پڑا کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

مجاز و حقیقت

محسوسات کا خوگر انسان کسی غیر مرئی و غیر محسوس حقیقت سے محبت نہیں کر سکتا۔ جو اس کے مدعی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی مجازی پیکر کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں یا حقیقت سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں۔ تصوّف کی ساری شاعری اسی حسین و کیف آور فریب کا مرقع ہے۔ یہی فریب ہے جو رومی کی "شاخِ نبات" کو "معشوقِ ازلی" اور حافظ

کی شراب ناب کو "بادۂ الست" کے تفسیری پیرہن پہنا کر سامنے لاتا ہے۔ غالب نے جب کہا تھا کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو یہ امرِ واقعہ کی ضد تھا۔ بات یہ نہیں کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کہے بغیر بن نہیں پڑتی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ بادہ و ساغر کو مشاہدۂ حق کی گفتگو کہے بغیر کام نہیں چلتا۔ بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا سلیم! کہ جس قسم کی محبت باہم انسانوں میں ہوتی ہے، خدا کے ساتھ اس قسم کی محبت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ دیکھو کہ آیاتِ مندرجہ بالا میں خدا سے بندوں کی محبت اور خدا کی بندوں سے محبت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

عربی زبان میں لفظ محبت کے معنی ہیں (۱) کسی چیز پر ثابت قدمی سے جم جانا۔ اور (۲) کسی کی حفاظت کرنا۔ اسے بلند کرنا، ظاہر کرنا۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کرنا۔ لہٰذا قرآنی آیات میں "خدا سے بندوں کی محبت" کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی کی ثابت قدمی سے، جم کر، اطاعت کرنا۔ خود سورۂ آلِ عمران کی آیت (۳/۳۲) میں اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ کے الفاظ نے "محبت" کی یہ تشریح کر دی ہے۔ دوسری طرف، خدا کی بندوں سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ خدا ان کی حفاظت کرتا ہے۔ انھیں بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کرتا ہے۔ ان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما کرتا ہے۔ یہ چیزیں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا فطری نتیجہ ہیں۔

یہ ہے سلیم! خدا کی محبت اور خدا سے محبت کا قرآنی مفہوم۔

کرامات

اب ہم سلیم! اُس "طوطے" کی طرف آتے ہیں جس میں تصوف کے اتنے بڑے "جن" کی جان ہے۔ یعنی "اولیاء اللہ کی کرامات"۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اس میں اتنی بڑی کشش پیدا کر رکھی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی ذہن، تمام عقلی دلائل اور علمی براہین کو بالائے طاق رکھ کر ان حضرات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ ذرا تصور میں لاؤ اس منظر کو کہ کسی مجمع میں قرآن کریم کے عظیم القدر حقائق و معارف بیان ہو رہے ہیں۔ بیان کرنے والا تاریخی شواہد، عصری انکشافات اور فلسفہ اور سائنس کی بلند ترین اسناد کی روشنی میں قرآنی دعاوی کی صداقت روزِ روشن کی طرح واضح کر رہا ہے کہ اتنے میں سڑک کے اُس پار کوئی مست ملنگ "ہو حق" کا نعرہ لگاتا ہے اور آنکھیں لال کر کے بالوں کو نچوڑتا ہے تو ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپکنے لگ جاتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ یہ سارا مجمع قرآنی حقائق و معارف کو یک قلم چھوڑ کر اُس مست ملنگ کے گرد جا کھڑا ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی ذہن، باایں ہمہ ادعائے علم و تمدن ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ اسے (بچوں کی طرح) بسیط حقائق کے مقابلہ میں محیر العقول عجائبات زیادہ تیزی سے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ قرآن، انسانی ذہن کی اسی خامی کو دور کرنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن تصوف اسے پھر اسی کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ اسی میں تصوف کی کامیابی کا راز ہے ——— بزرگوں کی کرامات ——— یہی وہ وادیٔ حیرت ہے جہاں پہنچ کر بڑے بڑوں کی عقلیں گم اور ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اسی سے یہ "مغزِ دین" قرار پاتا جاتا ہے۔ آؤ۔ دیکھو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے؟

تم میری کتاب (معراجِ انسانیت) کے "معجزات" کے باب پر نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ مخالفین بار بار نبی اکرمؐ سے معجزات کا تقاضا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر بار ان کے مطالبہ کو یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ ہم نے رسول کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا۔ اس کے معجزات صرف دو ہیں۔

(۱) یہ کتاب جس کی مثل و نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ (۲۹/۵۱) اور

(۲) خود اس (رسول) کی اپنی زندگی جو سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز ہے (۱۰/۱۶)

ان کے علاوہ اگر تم معجزات دیکھنا چاہتے ہو تو قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰/۱۰۱)۔ ارض و سموات پر غور کرو۔ قدم قدم پر معجزات دکھائی دیں گے۔

غور کرو سلیم! حضور نبی اکرمؐ کو تو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا جاتا لیکن یہ حضرات (جو حضورؐ کے متبع ہونے کے مدعی ہیں) ان سے قدم قدم پر کرامات ظہور میں آتی چلی جاتی ہیں؟ اگر اسلام کا ماحصل کرامات تھا تو سب سے پہلے ان کا ظہور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس سے ہونا چاہیئے تھا اور آپ کے بعد صحابہ کبارؓ سے۔ لیکن اس سارے عہد میں کسی کی کوئی اس قسم کی کرامت دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن جب ان (صوفیاء) کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو ان کی ایک ایک سانس میں کرامات رقص کرتی نظر آتی ہیں!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے؟

کرامات کی حقیقت

میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں سلیم! کہ کرامات کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک فنی چیز ہے۔ جسے جس کا جی چاہے حاصل کر لے۔ یہ قوتِ خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں جنہیں ہر شخص خاص انداز کی مشق و ریاضت سے پیدا کر سکتا ہے اس میں نہ کفر و اسلام کی کوئی خصوصیت ہے نہ شرک و توحید کی کوئی تمیز۔ یہ کچھ سلیم! میں جگ بیتی نہیں کہہ رہا۔ آپ بیتی کہہ رہا ہوں۔ اس داستان کی تفصیل طویل ہے (اگر کبھی میں نے اپنی زندگی کے تجارب کو قلمبند کیا تو یہ تفاصیل وہاں آسکیں گی) اس وقت صرف اس قدر بتا دینا کافی ہوگا کہ جن دنوں میں سلوک کی منازل طے کر رہا تھا، ہمارے ہاں (اکثر رات کی تنہائیوں میں) ہندو سنیاسی بھی آیا کرتے تھے۔ ان سے اس قسم کی خارق عادات کرامات سرزد ہوتیں کہ میں ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا۔ میرے دل میں اس زمانے میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اگر یہ چیزیں دین کا ماحصل (یا نتیجہ) ہیں تو ان مشرکین سے ان کا ظہور کیسے ہو جاتا ہے؟ یہ کھٹک میرے دل میں پرورش پاتی رہی —— یہاں تک جب میں دہلی سے شملہ پہنچا تو مجھ سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔ میں تحقیقِ حق کے لئے سادھوؤں کی سمادھیوں میں پہنچا۔ خود ایک یوگی کو اپنے گھر پر رکھا۔ اور اس کی زیرِ تربیت یوگ کے مراحل طے کئے۔ اور تم یہ سنکر حیران ہو گے کہ اس طریق سے بھی وہی کچھ ظہور میں آنے لگ گیا جس تک میں تصوف کے راستے پہنچا تھا۔ یوں میں نے سلیم! اپنے ذاتی تجربہ سے اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا کہ ان "کرامات" کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک فن ہے جس کے حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں ان میں سے ایک طریقہ تصوف کی ریاضتیں بھی ہیں۔ (مغرب میں اس فن کو بھی ایک قسم کی سائنس بنا دیا گیا ہے اور اس سے کئی قسم کے کام لئے جاتے ہیں جن میں عصبی بیماریوں کا علاج نمایاں حیثیت رکھتا ہے)۔

دین کی کرامات

دین کی کرامات اور ہوتی ہیں۔ اس نیم انسانی دنیا میں وہ انقلابِ عظیم برپا ہو جاتا ہے جس سے باطل کا ہر نظام الٹ کر اس کی جگہ ایسا نظام متشکل ہو جاتا ہے جو قوانینِ خداوندی (قرآن کے غیر متبدل اصولوں) پر قائم ہوتا ہے اور جس کا نصب العین دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر عدل و احسان کو عام کرنا ہوتا ہے۔ قرآن نے "ایمان و اعمالِ صالح" کا یہی نتیجہ بتایا ہے۔ جب کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انھیں دنیا میں حکومت عطا کرے گا جیسی حکومت اس نے ان لوگوں کو عطا کی جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ یہ حکومت ان کی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ مقصد اس سے یہ ہوگا کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ وہ ان کے لئے اس نظامِ حیات کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے متمکن کر دے۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ اور وہ ان کی حالتِ خوف کو امن میں بدل دے۔ تاکہ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا۔ وہ صرف میرے قوانین کی محکومیت اختیار کریں۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ (۲۴/۵۵) یہ تھا دین کا مقصودِ سلیم! تصوف اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کر کے فرار کی راہیں سکھاتا ہے۔ اس سے قرآن نے یہ کہہ کر متنبہ کیا تھا کہ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵)۔ جو اس واضح راہ نمائی کے بعد اس سے انکار و سرکشی اختیار کریگا تو یہی لوگ ہوں گے جو غلط روش پر چلیں گے۔

اب سمجھ لیا سلیم! تم نے کہ قرآن کی روشنی میں تصوف کی پوزیشن کیا ہے؟ وہی جو اقبال نے کہا تھا کہ

تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔ اور (اس کے امام) ابنِ عربی کی
فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں۔

اور جب نفسِ تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے تو پھر "اسلامی تصوف" اور "غیر اسلامی تصوف" کی تفریق و تقسیم کیا؟ جو نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک یا مشرب، اسلام کی سرزمین میں اجنبی ہو، اس کے اسلامی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انسانیت کو نقصانات

اب رہا یہ کہ تصوف نے انسانیت کو نقصان کس قدر پہنچایا ہے۔ تو اس کی تفصیل کے لئے کئی محجلات لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن میں تمہیں نہایت مختصر انداز میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ خود ان لوگوں نے جن کے ہاں سے ہم نے تصوف کو مستعار لیا ہے (یعنی خود عیسائیوں نے) اس کے نقصانات کے متعلق کیا چیخ و پکار کی ہے۔

تم نے برفو (BRIFFAULT) کا تو اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے۔

یہ تصوف پسند حضرات چاہتے ہیں کہ اس پُر از مصائب اور بد نما انسانی دنیا سے بھاگ جائیں۔ اور خلوت

کی تجرد گاہوں میں جا کر پناہ لیں جہاں صرف فطرت ہی فطرت ہو (انسان کوئی نہ ہو)۔ ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنہیں انسان کے ناپاک قدموں نے چھوا نہ ہو۔ وہاں جا کر اپنی روح کو فطرت کے کیف اندوز نظاروں سے سرشار کریں، بایں نمط کہ اس سرور آفریں کیفیات میں کوئی دخل اندازی نہ کرنے پائے اور ان کے اس جہانِ کیف و مستی میں انسانی دنیا کی ذلت و پستی کا کوئی گذر نہ ہو لیکن وہ نہیں جانتے یا جاننا نہیں چاہتے کہ ان کی یہ تمام حسین آرزوئیں یہ بلند تخیلات۔ یہ علو جذبات۔ انسان کے قلب کی یہ کیف باریاں۔ انسانی فطرت کی لغزشوں کا یہ احساسِ لطیف اور فطرت کے متعلق یہ حسن خیال، یہ سب اسی دنیائے انسانیت کی تخلیق ہے جسے وہ اس قدر قابلِ نفرت سمجھ کر تیاگ دینے کی فکر کر رہے ہیں۔ (THE MAKING OF HUMANITY P. 349)

جیسن اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے۔

اخلاق اس کا نام نہیں کہ آپ مادہ کے کثیف تاثرات سے بھاگ جائیں۔ اخلاقی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ آپ مادہ کا مقابلہ کریں۔ تخلیقی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ مادہ پیش کرتا ہے، اس سے متمتع ہوں...... اگر مذہب انسان کی توجہ مادیت سے ہٹا کر اس کے روحانی الاصل ہونے پر ہی مرکوز کر دے تو یہ اخلاق نہیں، مذہبی بد اخلاقی ہے...... نوع انسانی اسی صورت میں ترقی کر سکتی ہے جب مادی اور روحانی دونوں پہلو اپنے تضادات کے باوجود ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھتے جائیں۔ (P.P. 233, 337, 340)

برتو دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

اخلاقیات کے متعلق یونان کے ابتدائی تصور کا، رواقی اور ابیقوریت کے فلسفہ میں تبدیل ہو جانا ایسی خرابی کا موجب ہوا جس کی نظیر انسان کے اخلاقی تصور کی دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اخلاق، جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کے باہمی معاملات حق و صداقت پر مبنی ہونے چاہئیں، اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتا ہے، اگر اس کا نتیجہ نوع انسانی کی بہبود نہیں۔ اس سے تو اخلاقیات کا مقصد ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات کا مقصد ایک فرد کی ذاتی بہبود یا نجات نہیں (اگرچہ نوع انسانی کی بہبود میں فرد کی ذاتی بہبود بدرجہ اتم موجود ہے) بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس فرد کا اُس نوع انسانی کے ساتھ جس کا یہ ایک جزو ہے کس قسم کا تعلق ہے؟ اس (باہمی تعلقات اور معاملات) کے ضابطۂ اخلاق کی بنیاد عدل ہے...... عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ اور قاہرانہ قوت سے غالب نہ آ سکے...... اگر دنیا میں باطل کے کوئی معنی ہیں تو یہی ہیں کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض فرضی اقتدار کی بنا پر اپنا تابع فرمان بنا لے...... اسی باطل کا استیصال اخلاقیات کا کم از کم فریضہ ہے۔ آپ مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی شاندار عمارت کیوں نہ تعمیر کر لیں۔ اگر وہ باطل کا استیصال کر کے اس کی جگہ حق کو قائم نہیں کرتی تو وہ یکسر بے معنی ہے۔ یہ اوپر کی عمارت اخلاقیات کی

عمارت کہلا ہی نہیں سکتی۔ رواقی فلسفہ کی رُو سے نصب العین حیات، شر کا مقابلہ نہیں بلکہ اس کے سامنے جھک جانا رہ جاتا ہے۔ (P. 331, 332)

یہ رواقی فلسفہ وہی ہے جس پر ہمارے تصوّف کی عمارت استوار ہے۔ اور تصوّف کا فلسفۂ اخلاق (ETHICS OF MYSTICISM) عیسائیت کے فلسفۂ اخلاق کا چربہ ہے۔ اس فلسفۂ اخلاق کی رُو سے (جس کا منتہیٰ ایک فرد کی ذاتی نجات ہے) ظلم و استبداد کی قوتوں کو بدلگام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔ "خدا کے نیک بندے" حجروں اور خانقاہوں میں جا چھپتے ہیں اور شریر لوگوں کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کے خون کی رنگینی سے اپنے عشرت کدوں کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائیں عیسائیت کے فلسفۂ اخلاق کی یہی تباہ کاریاں تھیں جن سے متاثر ہو کر، ہسپانیہ کا پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) ان الفاظ میں چیخ و پکار کرتا ہے کہ

> عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے بالکل باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں سے جو ظلم و ستم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں جنھیں مصائب و شدائد نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے اور انھیں آئینِ محبت کی تعلیم دی ہے انھیں عفو و رحم کا سبق سکھایا ہے۔ انھیں خدا کی ربوبیت یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں سب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس، جور و استبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان، آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے۔ جو ان کی طرف فارقلیط کا پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہ گاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظامِ عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔ سینٹ ونسنٹ ڈی پال کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے۔ جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں۔ ان کی بیڑیاں چھنچھناتی رہیں وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں۔ عیسائیت کی روح انھیں جا کر تسلی دے گی۔ لیکن یہ اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت

اِن مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ اِن چیزوں کا اُسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصور۔ وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحم دلی کا سبق پڑھاتی ہے لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام ذمہ داریوں کا ترک..... تدبیہ آرزو...... عدم مدافعت، خاموش اطاعت، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا۔ غرضیکہ اس قسم کے متشدد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا۔ لیکن ظلم و استبداد اور جور و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

(—THE MAKING OF HUMANITY, P.P. 332-33)

جو کچھ اس پروفیسر نے عیسائیت کے متعلق کہا ہے وہ حرفاً حرفاً تصوّف پر منطبق ہوتا ہے۔ اس تصوّف نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا، اس کے متعلق بڑی سے بڑی تصنیف وہ کچھ نہیں کہہ سکتی جو کچھ علامہ اقبالؔ ان چار لفظوں میں کہہ گئے ہیں کہ

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

ہماری تاریخ انہی ڈوبے ہوئے سفینوں کی حدیثِ الم ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے تو ان سفینوں کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کرنا۔ والسلام۔

پرویز

ضرورتِ رشتہ

ایک غریب لیکن شریف خاندان کی اٹھارہ سالہ بیٹی کے لئے جو گھریلو ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے اہل اور قرآن کریم کی سادہ تعلیم سے بہرہ ور ہے ایسے رشتہ کی ضرورت ہے، جو قرآنی تعلیمات کا پابند ہو۔ جہیز وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔

ص ن۔ معرفت طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

سر سیّد احمد خانؒ

(۵)

نگارش و خطابت کا عراقِ دلنشیںؒ

آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن (اقبالؒ)

(محترم صفدر سلیمی صاحب)

یہ ایک خوش آئند اطمینان اور شرف و سعادت کا سرمایہ ہے کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعتوں میں حیاتِ سرسیدؒ کی جو تعارفی تفاصیل منظرِ اشاعت پر آتی رہیں، پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے لاتعداد حلقوں میں انھیں تحسین و تبریک کے مخلصانہ اور پرجوش جذبات سے خوش آمدید کہا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ پچیس برس میں ہماری ملّت کے پرجوش عوام نے فتحمندیوں اور کامرانیوں کے جو انقلاب انگیز معرکے سر کئے اور اس راہ میں اُسے ابتلاء اور آزمائش کے جن طوفانوں سے گزرنا پڑا ان کی ہنگامہ آرائیوں اور معجز نمائیوں میں وہ آغازِ سفر کے اُس نشان کو آہستہ آہستہ نظر انداز کر بیٹھی جو اس کاروانِ شوق کے طائرِ پیش رس (سرسیّدؒ) کے ذوقِ سفر کا عنوان تھا لیکن

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

تاریخ کے ان مستور حقائق سے جونہی "خود فراموشیوں" کا یہ پردہ اٹھا اور ماضی کے مطلعِ تاریخ سے سرسیّد جیسے سالارِ انقلاب کی شخصیت اپنے درخشندہ کارناموں کے جلو میں ابھر کر سامنے آئی تو سب نے ایک بار پھر یہ محسوس کیا کہ اگر ایک صدی قبل صبحِ امید کا یہ ستارا ہمارے آسمانِ تقدیر پر نمودار نہ ہوتا اور یہ بانگِ رحیل ہمیں آمادۂ سفر نہ کرتی تو متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں ہماری موت کا مرثیہ لکھا جا چکا ہوتا اور اس برصغیر کے نئے خاکوں میں ہماری قومی حیثیت ایک قبرستان سے زیادہ نہ ہوتی۔ حیاتِ سرسیّد کو اس تیزی سے بھول جانا ہمارے نزدیک ہماری قومی بدنصیبیوں کا افسوسناک نشان ہے اور سرسیدؒ کے جانشینوں کو بالخصوص آج یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ اس متاعِ عزیز کے بدلے

ہیں ان کا یہ تغافل ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملت کے اس عظیم و جلیل محسن کو اس مجرمانہ انداز سے بھلائے جانے میں جہاں ان کے اپنے جانشینوں کا بڑا حصہ ہے وہاں (ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ) ان کے دشمنوں کی سازش کو بھی کچھ کم دخل نہیں۔ یہ قیامت ہے کہ اپنوں کے مجرمانہ تغافل اور دشمنوں کی مکارانہ سازش نے اس گوہرِ رخشندہ کی آب و تاب کو گرد و غبار کے سپرد کر دیا۔ وہی عناصر جو اپنی ملت کی نشاۃ ثانیہ کے اس نقیب سے ساری زندگی نبرد آزما رہے اور پھر تحریکِ پاکستان کے خلاف دشمنوں کے ہاتھ میں کھیلتے رہے قیامِ پاکستان کے بعد یہاں جگہ بجگہ مذہبی اجارہ داری کے مقدس نقاب اوڑھ کر قرآن و سنت کی مسندوں پر براجمان ہو گئے۔ اور پھر وہ دردناک مرحلہ بھی سامنے آیا جب اربابِ سیاست کی ہوسِ اقتدار اور محلاتی سازشوں نے اپنی مفاد پرستیوں کی خاطر اس نوزائیدہ مملکت کو ان "مقدس لیڈروں" کے سپرد کرنے کی ٹھان لی جو اقامتِ دین کے نام پر رہزنی کرتے تھے۔

قومی خودکشی، خود فریبی بلکہ خدا فریبی کا شاید ہی کوئی ایسا حادثہ تاریخ میں نمودار ہوا ہو کہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک قوم نے ایک صدی تک مسلسل جان لڑائی ہو۔ آگ اور خون کی کئی خندقیں راہ میں عبور کی ہوں۔ اور پھر جب وہ اسلام کے نام پر ایک آزاد مملکت میں اپنا پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گئی ہو تو وہاں تشکیلِ دین کی نازک ذمہ داریوں کی امامت میں ان عناصر پر تکیہ کر لیا گیا ہو جو نہ صرف دین کی کسی ایک مستقل قدر پر کبھی آپس میں متفق ہو سکے ہوں بلکہ انھوں نے ان زعمائے ملت کے خلاف اپنی آستینوں میں بغض و عناد اور جوشِ انتقام کی بجلیاں بھی چھپا رکھی ہوں جن کے ایک صدی کے اضطرابِ مسلسل اور سعیٔ پیہم نے قوم کو اس منزلِ مقصود تک پہنچایا ہو۔ حالانکہ آج کوئی بھی اس حقیقت سے انکار کی جراٴت نہیں کر سکتا کہ ان عناصر نے نہ صرف سرسیدؒ سے لے کر قائدِ اعظمؒ تک تمام زعمائے ملت سے دشمنانِ دین سے بڑھ چڑھ کر کھلی جنگ کی بلکہ اس تحریک کو بھی اپنی فتنہ انگیز اور گھناؤنی مخالفت کے زہریلے تیروں سے لہولہان کیا جو آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے لئے سرسید کے پیچ و تاب کی صورت میں ابھری اور اقبالؒ و جناحؒ کے فکر و عمل سے حاصلِ مراد کو پہنچی۔

یاد رکھیے کہ یہ عناصر سرسیدؒ اور اس کے جانشینوں کے خلاف پیدائشی اور گھناؤنے بغض و عناد کا ورثہ اپنے سینوں میں لئے چلے آ رہے ہیں اور سرسید اور اس کے مکتبِ فکر کے خلاف (جو حصولِ پاکستان کا محرک تھا) ان کے دلوں میں جوشِ انتقام کی آگ آج بھی برابر سلگ رہی ہے۔ قیامت یہ ہوئی کہ سرسیدؒ کا مکتبِ فکر تو حصولِ پاکستان کی فتح کو اپنی منزلِ مقصود سمجھ کر خود فراموشیوں کے شبستان میں گہری نیند سو گیا۔ لیکن یہ مخالف عناصر مذہبی اجارہ داری کے روپ میں اپنی مسندوں کو منظم اور مضبوط کرتے چلے گئے اور انھوں نے نامحسوس طور پر افرادِ ملت کے ذہنوں میں ان زعمائے ملت کے خلاف ایسے تاثرات پیدا کرنے بھی شروع کر دیئے کہ اور تو اور سرسیدؒ جیسا عظیم امام انقلاب بھی عہدِ کہن کا ایک سطحی قسم کا آزاد خیال اور عام انسان (بلکہ بدعقیدہ مسلمان) بن کر رہ گیا۔ اور اس کی عظیم و جلیل اور بلند و بالا شخصیت کے خلاف (مخالفانہ پروپیگنڈے کے زیرِ اثر) ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی زبانیں کھلنے لگیں جن کی تعلیم و تربیت کی متاعِ بے بہا سرسید کے دیدۂ تر کی بے خوابیوں اور نالہ ہائے نیم شب کا صدقہ تھی۔ اپنے زعیم کے احساناتِ عظیم سے روگردانی کی یہ دردناک مثال ہے۔ اور سرسید کے نقادِ تاریخ کی اس لازوال حقیقت کو کس بے نیازی (اور بے دردی) سے نظرانداز کر گئے ہیں کہ اگر ہمارے آسمانِ

تقدیر پر صبحِ امید کا یہ ستارہ جلوہ بار نہ ہوتا تو آج قوم بے بسی، زوال اور شکست کے جہنم میں دم توڑ چکی ہوتی۔

ہماری قوم اگر حقیقت پسند عناصر سے کلیۃً بے نصیب واقع نہیں ہوئی، اور ایسے افراد موجود ہیں جنھیں سرسید جیسے مسیحائے قوم کے قلبِ مضطر کی بے تابیوں اور اس کے دیدۂ تر کی بے خوابیوں کا صحیح اندازہ ہے اور وہ تاریخ اور اُس کے بین السطور سے بخوبی یہ سمجھ چکے ہیں کہ اس مسیحائے قوم نے اپنی نصف صدی کی جگر کاویوں، جاں گدازیوں اور شب بیداریوں سے ہمیں نئی زندگی عطا کی تو اِن حقیقت پسندوں کے لئے یہ وقت ہے کہ وہ زمانے کے تقاضوں کی پکار کو سنیں۔ اور وہ پکار یہ ہے کہ اگر تم اپنی نشاۃِ ثانیہ کے اس نقیبِ اول کو بھول گئے تو یقیناً تم آغازِ سفر کے اس نشانِ منزل کو بھی نگاہوں سے اوجھل کر بیٹھو گے جہاں سے سرسید کی بانگِ رحیل نے ہمتیں اور ذوقِ سفر سے مالا مال کر کے جادہ پیمائی کے قابل بنایا اور پھر تم نے آگے بڑھتے بڑھتے اُس منزل پر اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

جسے تاریخ نے حصولِ پاکستان کا نام دیا۔ یاد رکھیئے کہ آج ہمیں اپنے ہاں آزادی کی جو رونقیں اور استقلال کے ہنگامے نظر آ رہے ہیں یہ اُسی زعیمِ ملت کے سہانے خوابوں کی درخشندہ تعبیریں ہیں۔ اسے کبھی نہ بھولیئے کہ اس زعیم کے ولولہ ہائے ذوق و شوق محض خوابوں تک محدود نہیں تھے وہ ان خوابوں کو ممکناتِ زندگی سے ہم آغوش کرنے کے لئے ستاروں پر کمندیں پھینکنا بھی جانتا تھا اور مشکلات و موانعات کے پہاڑوں کو روندنے کا عزم و ایثار بھی رکھتا تھا۔

ہم اس کی زندگی کے کتنے ہی اہم گوشوں کو اپنے قارئین کی نگاہوں کے سامنے لا چکے ہیں اور کتنے ہی اہم گوشے ابھی باقی ہیں جن کی نقاب کشائی کی ضرورت ہے۔ سرسید جیسا ہمہ صفت موصوف قائد اس دور میں شاید ہی کسی قوم کو نصیب ہوا ہو۔ وہ بیک وقت مدبر بھی تھا اور مفکر بھی۔ ایک حقیقت نگار انشاء پرداز بھی تھا اور آتش بیان خطیب بھی۔ وہ ایک پُر وقار پارلیمینٹیرین بھی تھا اور صاحبِ عزم ریفارمر بھی۔ اس نے قومی تعلیمات کی نور پاشیوں سے تیرہ و تار فضاؤں کو منور بھی کیا۔ اور بے مثال مدبرانہ سیاست کے زور پر ہندو اور انگریز کی سازشوں کا طلسم بھی توڑا۔ اُس نے سفینۂ ملت کو طوفانوں سے بچا کر ساحلِ مراد کی طرف اُس کا رُخ بھی موڑا اور منزل کی نشان دہی بھی کی۔ مولانا صلاح الدین احمد کے الفاظ میں :-

> درحقیقت سرسید کے روپ میں قوم کو ایک جن مل گیا تھا جو چشم زدن میں اس کے لئے ہر وہ کام کر دیتا تھا جو برسوں میں ثروت و حکومت کے سہارے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی غیروں کے حملوں کی روک تھام کی جا رہی ہے۔ کبھی اپنوں کے دماغ سے اوہام کے جالے صاف کئے جا رہے ہیں۔ کہیں گرمی کی جلجلاتی دھوپ میں معماروں اور باغبانوں کی ردا العلوم علی گڑھ میں) نگرانی کی جا رہی ہے۔ کہیں نئے تصورات کی تحصیل اور پُرانے اعتقادات کے تحفظ کے لئے سات سمندروں کے سفر کئے جا رہے ہیں۔ کہیں ملک کی مجالسِ قانون ساز میں قومی مفاد کے لئے تگ و دو کی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ خطباتِ احمدیہ۔ تہذیب الاخلاق اور تفسیر القرآن کے ذریعے اذہان کی روشنی اور اخلاق کی بلندی کا سامان بھی فراہم ہو رہا ہے۔ غرضیکہ ترقی و تربیت کا ایک معرکۂ عظیم ہے جس کے مختلف محاذوں پر بیک وقت یورش جاری ہے

اور دفاع بھی۔ اور بوڑھا سپہ سالار ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں شمشیر عمل لئے ہر مورچے پر مثلِ برق پہنچتا اور مثالِ ابر گرجتا ہے۔

حیاتِ سرسید کی ہمہ گیری اور ہمہ آرائی کی یہی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ہمارے لئے اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ تین اہم ترین گوشوں کی تفصیل کے بعد ہم اب کس نئے گوشے کا انتخاب کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک گوشے میں بھی اس کی کاوشوں کا سلسلہ دوسرے سے کم نظر نہیں آتا۔ بلکہ زندگی کے ان تمام گوشوں میں نصف صدی کی مسلسل جدوجہد کے باعث ایسا امتزاج قائم ہو گیا ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں۔ چنانچہ اس مجموعۂ صفات کے متعلق مولانا حالی نے بعض غیر مسلم مشاہیر کے اقوال بیان کئے ہیں۔ ایک بہت بڑے انگریز کا (جس کا نام مولانا حالی نے نہیں بتایا) قول ہے۔

یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فردِ کامل ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے۔ لیکن ایسے جامع صفات اشخاص جیسے کہ سرسید احمد خاں ہیں وہاں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

اسی طرح الٰہ آباد کے ایک جلسہ عام میں ایک لائق اور فاضل پنڈت نے (جیسا کہ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ نے تحریر فرمایا ہے) کہا تھا

ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں۔ تعلیم میں فائق ہیں۔ تعداد میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم میں کوئی سرسید نہیں۔ بلکہ ہم میں سے بیس مل کر بھی ایک ہو جائیں تو سرسید کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔

ایسی جامع الصفات شخصیت کے متعلق یہ تو مشکل نہیں تھا کہ اُس کی زندگی کے دو تین اہم گوشے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں کیونکہ یہ گوشے ایسے ہیں جو ہمیشہ ایک رہنمائے قوم کی زندگی میں سب سے پہلے تلاش کئے جاتے ہیں اور انھیں ہمیشہ ایک قائد کی عظمت کا حقیقی معیار قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک سرسید کا تعلق ہے وہ علم رہنماؤں کے مقابلے میں بہت سے مزید کمالات سے بھی متصف تھے۔ وہ ایک عظیم سیاستداں، ایک عظیم مفکر اور قومی تعلیمات کے عظیم داعی ہی نہیں تھے بلکہ ان کے علاوہ اور بہت کچھ بھی تھے۔ ہمارے لئے اب مشکل یہی ہے کہ ان مزید خوبیوں میں سے کسے فوقیت دیں۔ کیونکہ وہ ان سب میں برابر ممتاز تھے۔ چنانچہ اس بار ہم اس تذکرے کے سلسلہ میں ان کی جن صلاحیتوں کا انتخاب کر رہے ہیں۔ وہ دوسری خوبیوں سے ان کی امتیازی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے سلسلۂ بیان میں ربط قائم رکھنے کے لئے ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اشاعتِ زیرِ نظر میں ہمارا موضوع سرسید کا وہ مقام ہے جو انھیں تحریر اور تقریر میں حاصل تھا۔

حقیقت نگار مصنف

جب ہم اس عظیم قائد کی شب و روز کی سیاسی اور تعلیمی جدوجہد کے تسلسل کو دیکھتے ہیں جس میں وہ قوم کی بگڑی بنانے کے لئے سالہا سال تک پیہم سرگرم کار رہے تو ہمارے لئے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایسا زعیم جو ایک ہی وقت میں کئی محاذوں پر چومکھی جنگیں لڑ رہا تھا تصنیف و تالیف کے لئے بھی فراغت نکال سکا ہو اور اس قابل ہو سکا ہو کہ اپنی تحریروں سے قوم کے علمی سرمائے میں اضافہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس میدان میں

بھی وہ علمی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر اتنا کچھ لکھ گیے جسے اگر یکجا کیا جائے تو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔

سرسید کے رفقاء مولانا حالیؔ اور مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اس سلسلہ میں جو کچھ "حیاتِ جاوید" اور "حالات و افکار" میں لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمہ گیر طبیعت دیگر اہم امور کے ساتھ ساتھ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتی تھی۔ کالج کی تعمیر کا سلسلہ ہو یا بجٹ کی تیاری، جلسوں کا اہتمام ہو یا احباب کی مہمانداری، چندوں کا سلسلہ ہو یا کوئی سیاسی معرکہ آرائی۔ ان کے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بہرحال جاری رہتا۔ خود ان کے اپنے قول کے مطابق جتنا ان کا جی تصنیف و تالیف میں لگتا تھا اتنا کسی دوسرے کام میں نہیں۔ خوشی کا عالم ہو یا رنج و غم کی کیفیت وہ بستر مرض پر پڑے ہوں یا ہشاش بشاش اور صحتمند، خلوت ہو یا جلوت ہر حالت میں ان کے سامنے لکھنے پڑھنے کا سامان موجود رہتا تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ بستر چھوڑ کر میز کرسی سنبھال لیتے اور مضمون لکھتے لکھتے صبح کر دیتے۔ جن دنوں وہ اپنی مشہور تصنیف "تبئین الکلام" کو مکمل کر رہے تھے۔ انھوں [illegible] پر سونا تک ترک کر دیا تھا۔ فرش پر چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوتے اور ان کے بیچ میں ان کی نشست ہوتی۔ احباب سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور یہ تفسیر بھی لکھی جاری رہتی۔ جب نیند کا غلبہ طاری ہو جاتا تو وہیں کسی کتاب پر سر رکھ کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ نیند پوری کر لیتے اور اس کے بعد پھر لکھنا شروع کر دیتے۔ رات ہو یا دن، اُن کے جذب نگارش میں دونوں کا امتیاز جذب ہو کر رہ گیا تھا۔ صبح سے شام تک آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لیکن ہمیشہ دیکھا گیا کہ مختلف معاملات میں اہم مذاکرات بھی جاری رہتے اور قلم کی روانی بھی۔ اس سے اِن کے خیالات میں کبھی انتشار یا خلل پیدا نہ ہوتا تھا۔ حالانکہ ان کا موضوع ہمیشہ سائنس، آرٹ اور مذہب کے اہم مسائل پر مشتمل ہوتا اور وہ مجلسی شور و شر کے باوجود لکھتے بھی جاتے اور ساتھ ساتھ کہتے بھی۔ تصنیف و تالیف کے معاملے میں اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت انگیز ان کا یہ کمال تھا کہ انھیں نہ تو کبھی اپنے تحریر شدہ مضمون کی ترتیب بدلنی پڑتی اور نہ قطع و برید کی ضرورت پیش آتی۔

قوتِ استدلال

سرسید کی تحریروں کا ایک امتیازی نشان ان کی مخصوص قوتِ استدلال ہے۔ انھوں نے سیاساتِ وطنی کے موضوع پر بھی "اسبابِ بغاوتِ ہند" اور ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں "لائل محمڈنز آف انڈیا" جیسی اہم کتابیں لکھیں۔ اور "مذہبیات" کے سلسلہ میں بھی "تفسیر القرآن" "تبئین الکلام" اور "خطباتِ احمدیہ" جیسے قلمی شاہکار چھوڑے۔ مزید برآں "تہذیب الاخلاق" "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور دیگر اخبارات میں سینکڑوں مقالات لکھے۔ یہ سب تحریریں شہادت دے رہی ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا بالآخر باشعور طبقوں کو اس کی صداقت اور حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور یہ سب نتیجہ تھا اُس عظیم قوتِ استدلال کا جو ان کی ہر تحریر میں صاف جھلکتی نظر آئے گی۔ "اسبابِ بغاوتِ ہند" کی اشاعت کو ان کے حلقۂ احباب نے بہت بڑے خطرے کی دعوت قرار دیا۔ اندیشہ تھا کہ اس حق گوئی و بے باکی سے، زخم خوردہ اور فاتح حکمرانوں کی جبینِ ناز شکن آلود ہو جائے گی۔ اُس کا جوشِ انتقام بھڑک اٹھے گا اور سرسید اربابِ اقتدار کے غیظ و غضب کی زد میں آ جائیں گے۔ لیکن سرسید اپنی قوتِ استدلال کی معجز نمائی اور انگریز کی حقیقت پسندی کی رگ رگ سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے انھوں نے ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر ایک

نازک مرحلے پر اس کتاب کو شائع کر دیا۔ اور سب کو بخوبی معلوم ہے کہ بجائے اس کے کہ حکمرانوں کی آتش انتقام اس سے بھڑک اٹھتی وہ سرسیّد کے پیش کردہ حقائق اور دلائل و براہین کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انھیں نہ صرف یہ کہ اپنی سیاسی لغزشوں اور فروگذاشتوں کا کھلا اعتراف کرنا پڑا بلکہ اپنی پالیسی کو بھی نئی ترتیب دینی پڑی۔

ڈاکٹر ہنٹر کی "انڈین مسلمانز" کا جو مدلل اور منہ توڑ جواب انھوں نے "لائل محمڈنز" کے نام پر دیا۔ اس کی قوتِ استدلال ہی تھی جس پر انگلستان تک سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور انگریزی اخبارات نے ان مندرجات کی سچائی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر کی خوب خبر لی۔

سادگی اور بیساختگی

واضح رہے کہ سرسیّد کی تحریروں نے اس امر کے باوجود یہ معرکے سر کئے کہ ان میں نہ کہیں الفاظ کی شوکت ہے۔ نہ استعارات و تشبیہات کا تکلف نظر آتا ہے اور نہ تلمیحات و تمثیلات کا کوئی مصنوعی بانکپن۔ انتہائی سادگی اور انتہائی بے ساختگی ــــ یہ تھا ان کی تمام تحریروں کا سرمایہ جو طرزِ بیان کی سادگی میں قوتِ استدلال کی پُرکاری کا جوہر لئے ہوئے تھا۔ یہی سادگی حقیقت پسند دشمنوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی اور یہی قوتِ استدلال تھی جس سے فکر و بصیرت کے شبستان جگمگا اٹھتے تھے۔ "آثار الصنادید" سرسیّد کے ابتدائی دور کی مشہور تصنیف ہے اور ان کی تمام تصانیف میں یہی ایک کتاب ایسی ہے جس میں ایک حد تک تکلف بھی پایا جاتا ہے اور ساختگی بھی۔ اور خود سرسیّد کے اپنے ایک قول کے مطابق ان کے بجائے مولانا صہبائی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ گو اس دور میں بھی سرسیّد کی تحریریں سادگی کا رنگ لئے ہوتی تھیں لیکن اُس دور کی عام روش کے مطابق انھوں نے ضروری سمجھا کہ جن تاریخی آثار کی تحقیقات میں انھوں نے جانکاہ سعی و کاوش سے کام لیا۔ "آثار الصنادید" میں ان کی تفصیل کا سیدھا سادہ انداز کہیں اس کی اہمیت کو بے وزن بنا کر نہ رکھ دے۔ لیکن اس کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہوتے ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ تحریر کا سیدھا سادہ والہانہ اور نیچرل اسٹائل جس قدر ذہنوں کو اپیل کرتا ہے وہ پُرتکلف عبارت سے ممکن نہیں۔ چنانچہ اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب نظرِ ثانی کے بعد شائع ہوا تو اس کا انداز تحریر ہر قسم کے ادنیٰ تکلفات سے پاک تھا۔ یہی ایڈیشن تھا جس کی شہرت یورپ تک پہنچی۔ مشہور فرانسیسی ادیب موسیو گارسان دتاسی نے اسے فرانسیسی زبان کا لباس پہنایا۔ اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف لندن نے ملکہ وکٹوریہ کی سرپرستی میں اس اہم تصنیف پر انھیں اعزازی رکنیت کی سند پیش کی۔

ندرتِ فکر اور تجدد پسندی کا اعجاز

جیسا کہ ہم وضاحت سے بتا چکے ہیں سرسیّد نے فکر و بصیرت کے ہر گوشے میں مسلکِ تقلید اور مروجہ روش سے بغاوت اختیار کی اور زندگی کے ہر شعبے میں تجدد پسندی اور ندرت کاریوں سے نئی راہیں ہموار کیں۔ ان کے اچھوتے نظریات و تصورات کی جھلک ان کی ہر تحریر میں پائی جاتی ہے بلکہ ان کی اکثر بلند پایہ تصانیف (تفسیر القرآن، خطباتِ احمدیہ، تبیین الکلام وغیرہم) تو عوام کے مروّجہ عقائد و نظریات کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ ندرتِ فکر اور تجدید نظر اس قدر انوکھی اور اثر انگیز ثابت ہوئی کہ ملت کے

باشعور عناصر نے پہلی طائرانہ نظر میں اگر اس سے اختلاف ظاہر کیا، تو تھوڑے سے سنجیدہ غور و فکر کے بعد وہ اس کی صداقت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ سرسید کے بہترین رفیق کار اور جانشین (نواب محسن الملک (مولوی سید مہدی علی خاں) جن کے ذہن پر ابتدا میں مذہبی رنگ بڑی شدت سے مسلط تھا اکثر مذہبی مسائل میں سرسید سے شدید اختلاف کیا کرتے لیکن جب اس سلسلہ میں سرسید کی کوئی تحریر سامنے آتی تو ان کی قوتِ استدلال کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ چنانچہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب سرسید نے غلامی کو غیر اسلامی مسلک قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف اظہارِ خیال کیا تو نواب موصوف نے سخت مخالفت کی اور انھیں چیلنج کیا کہ "تم غلامی کے خلاف اپنے موقف کی تائید میں ادنیٰ دلیل نہیں لا سکتے"۔ لیکن جب سرسید کی کتاب "ابطالِ غلامی" کے موضوع پر شائع ہوئی اور انھوں نے دقتِ نظر سے اس کا مطالعہ کیا تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ اسلام نے واقعی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلامی کا استیصال کر دیا ہے۔

سرسید کی ضخیم اور لاتعداد تصانیف میں اس قسم کے بے شمار مقامات نگاہوں کے سامنے آئیں گے جن پر اگر سطحی طور پر غور کیا جائے تو وہ محتاجِ ثبوت نظر آئیں گے لیکن جب ان دلائل پر نظر پڑے گی جو سرسید نے تائید میں پیش کئے ہیں تو ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی بشرطیکہ وہ حقیقت پسندی سے بہرہ ور ہو ان کی صداقت کی شہادت دے گا۔ ڈاکٹر ہنٹر اور سر ولیم میور جیسے عظیم مصنفین نے اپنی تصانیف میں حضور نبی اکرمؐ اور اسلام پر جو بھرپور حملے کئے ان کے جواب میں سرسید نے جن دلائل و براہین سے مسلح ہو کر اسلام کی مدافعت کی اس سے مسلمان ہی نہیں بلکہ یورپ کے چوٹی کے عیسائی علماء و فضلاء تک جھوم اٹھے اور انھوں نے برملا کہا کہ سرسید کی قوتِ استدلال، اور برہانِ قاطع کی کاٹ کا جواب نہیں۔ حالانکہ مذہبی تعصب اور عیسائیت سے ان کی وابستگی کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے ہم عقیدہ اور ہم مذہب فضلاء کے ان حملوں کی تائید کرتے جو انھوں نے ان کے مخالف مذہب (دینِ اسلام) پر کئے تھے۔ یہی ہے سرسید کی نگارشات کا وہ مدلل اور فاتحانہ انداز جس نے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا۔ تحریر کی ان اثر انگیزیوں میں سادگی اور قوتِ استدلال ہی کام نہیں کرتی تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ اُس حسنِ نیت، خلوصِ فکر اور جذبِ دروں کی ہمہ گیری و ہمہ آرائی تھی جو سرسید کے قومی احساس کی تڑپ اور خلش میں ڈوب ڈوب کر صفحۂ قرطاس پر بکھرتا تھا۔

چند نقوشِ تحریر

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم اس حقیقت نگار قومی زعیم کی چند ایسی تحریروں کو تمثیلاً پیش کریں جو ان کے اندازِ نگارش کی ان خوبیوں کی آئینہ دار ہوں جو ابھی ابھی ہم نے بیان کی ہیں۔ انھوں نے ایک موقع پر امام غزالیؒ کی کتاب "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" پر بڑا معنی خیز تبصرہ کیا تھا۔ اس میں امت کے مختلف گروہوں کے ذکر کے بعد وہ اپنے عہد کے علمائے کرام کے بعد صوفیائے عظام کے "مقدس طائفہ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> یہ دوسرا فرقہ بھی نہایت ہی خوفناک ہے۔ جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ "ان کا دل دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے۔ کامل ریاضت سے مجلّا ہے۔ خدا کی یاد سے منوّر ہے۔ فکر کی شیرینی سے شیریں ہے، شریعت کی پابندی سے مزین ہے، مشکوٰۃِ نبوت سے روشنی پاتا ہے۔ آئینہ کی مانند شفاف ہے ان کا نور ایسا شیشے کی ہنڈیا میں بے آگ کے سلگتا ہے۔ نور کے چمکارے ان کے دل سے نکلتے ہیں۔" ہاں

یہ سچ ہے کہ اس فرقہ نے (علماء کی طرح) ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور درہم و دینار کو اپنا قبلہ نہیں بنایا۔ مگر خود ہوائے نفس نے ان کو اپنا خدا اور خود سلاطین نے اپنا معبود اور درہم و دنانیر نے ان کو اپنا قبلہ بنایا ہے۔ پھر ان کو بنانے کی حاجت کیا تھی؟

چند سطور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے۔ اس لئے یہ اور زیادہ مسکین و منکسر بنتے ہیں۔ سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت ان کو "دنیا" دلاتی ہے۔ اس لئے یہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں بے طمعی محنت کے بغیر حاجت سے بڑھ کر درہم و دینار دلاتی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں اس لئے ان کے دل میں دوسروں کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے..... برائی اور بھلائی دوزخ و بہشت اور کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ کسی کو کافر بناتے ہیں اور کسی کو مرتد۔ کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو جنت۔ کبھی خازن جنت ہیں، کبھی مالک جہنم۔ یہ تمام باتیں حضرت کو ایسا شخص بنا دیتی ہیں جس کے نہ کان رہتے ہیں کہ کچھ سنیں۔ نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں۔ نہ منہ رہتا ہے جو حق بات کہیں۔

اور پھر سنیئے کہ اس دلخراش اور جگر پاش صورت حال سے مضطرب ہو کر وہ کس والہانہ انداز سے لکھتے ہیں۔

افسوس! خدا ہاتھ نہیں آتا۔ جناب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود نہیں ورنہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لے جاتا اور کہتا کہ اے خدا! اور اے جناب رسول خدا! محاکمہ کرو تم مجھ میں اور ان میں۔ اور بتاؤ کہ تمہارا دوستدار آخر کون ہے؟ میں گنہگار؟ یا یہ دیندار؟ اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست تو یہ معرکہ ہو کر رہے گا۔

ایک جائزہ

سرسید کی نگارشات کا آغاز ۱۸۳۷ء میں ہی جبکہ ان کی عمر ابھی بمشکل سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی ہو گیا تھا انہوں نے سب سے پہلے "سید الاخبار" میں جو ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے جاری کیا تھا لکھنا شروع کیا اور پھر اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک اس اخبار میں اہم مقالات لکھنے کے علاوہ کئی کتابیں اور رسالے بھی تصنیف کئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آ چکا تھا اور وہ ایک زعیم قوم کی حیثیت سے اپنی زندگی قوم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ پھر وہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں بڑے بلند پایہ مقالات لکھتے رہے اور بڑی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ یہ سینکڑوں مقالات اور درجنوں تصانیف اہم سیاسی، مذہبی اور علمی موضوعات پر مشتمل تھیں۔ وہ فارسی زبان میں بھی اتنی ہی روانی اور آزادی سے لکھتے تھے جتنا کہ اردو میں۔ ان کے کئی ایک مکتوبات، مقالات اور لیکچر فارسی زبان میں بھی تھے۔ افسوس کہ اردو کے ساتھ ان کے فارسی لٹریچر کا اکثر سرمایہ اب نایاب ہو چکا ہے۔ یہ نایاب سرمایہ اردو اور فارسی کے ہزاروں صفحات پر مشتمل تھا۔ اسے اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو ان کی بقیہ تصانیف کی ضخامت

بھی ہزاروں صفحات سے کم نہیں۔ ان تصانیف کی جو تفصیل مولانا حالی اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے وہ درج ذیل ہے

— مذہبی —

۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب
۲۔ تحفۂ حسن
۳۔ کلمۃ الحق
۴۔ راہِ سنت در ردِّ بدعت
۵۔ نسیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ
۶۔ تبیین الکلام فی التفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام
۷۔ خطباتِ احمدیہ
۸۔ تفسیر القرآن
۹۔ النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی
۱۰۔ ترمیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم
۱۱۔ ازالۃ الغین عن ذی القرنین
۱۲۔ رسالہ ابطال غلامی
۱۳۔ الدعاء والاستجابۃ
۱۴۔ تحریر فی اصول التفسیر
۱۵۔ تفسیر السمٰوٰت

— تاریخی —

۱۶۔ جامِ جم
۱۷۔ آثار الصنادید
۱۸۔ سلسلۃ الملوک
۱۹۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور
۲۰۔ اسباب بغاوت ہند
۲۱۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو
۲۲۔ ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر اعتراضات

— علمی —

۲۳۔ تسہیل فی جر الثقیل
۲۴۔ قول المتین در ابطالِ حرکت زمین
۲۵۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار

سرسیدؒ کا ملکہ خطابت

دنیا میں بہت کم زعماء ایسے ملیں گے جن میں تحریر اور تقریر کی خوبیاں بیک وقت جمع ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بہت بڑا ادیب۔ مقالہ نگار اور انشاء پرداز ہو۔ وہ اپنی نگارشات سے مردہ جذبات میں ایک آگ سی بھڑکا دے اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے قلب و نظر کے زاویئے بدل کر رکھ دے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ وہ اس کمال کے ساتھ خطابت کے اوصاف سے بھی مالا مال ہو اور اپنی آتش بیانیوں اور شعلہ مقالیوں سے جمود و سکوت کی مرگ آسا فضا میں انقلابِ حیات کی بجلیاں بھر دے۔ سرسید کی جامع الصفات شخصیت کے گوناگوں اوصاف میں یہ امتیازی وصف بھی تھا۔ انداز بیکتائی موجود تھا کہ جہاں وہ اپنی قوتِ تحریر سے دوسروں پر اپنے مقاصد کی سچائی کا سکہ بٹھاتے چلے گئے وہاں زورِ خطابت سے بھی قدم قدم پر نئے معرکے سر کئے۔ قوم کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ان

کی فکر و بصیرت وہ سرچشمۂ آبِ حیات ثابت ہوئی جس سے نگارش و خطابت کی ندیاں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رواں دواں تھیں۔ یہی وہ عراقِ دلنشین کا ساز تھا جس کی صدائے رحیل تحریر و تقریر کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر جب صفحۂ قرطاس پر بکھرتی تھی تو نشانِ منزل کا کام دیتی تھی اور جب کسی پلیٹ فارم سے فضا میں مرتعش ہوتی تھی تو کاروانِ شوق کی رگوں میں آتشیں عزائم اور ولولے برپا کر دیتی تھی۔

اندازِ تقریر کی اثر انگیزیاں

ایک بہت بڑے اور فاضل انگریز نے ان کی تقریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اگر یہ درست ہے کہ اچھا ذہن ہے جس کا انجام اچھا ہو تو پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ سرسید کو جو کامیابی اپنی بے مثال فصاحت سے حاصل ہوئی وہ ان کے حسنِ نیت اور حمیتِ اسلامی کا ثبوت ہے۔ ان کی تقریروں نے معجزانہ کیفیت پیدا کی اور ان کی فصاحت کے تند و تیز سیلاب نے ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ (ان کے اس کمال کام پورا پورا اندازہ لگانے کے لئے قوم کی اس دردناک کیفیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس میں سرسید کی فصاحت و بلاغت نے اپنی خطابت سے ایک عظیم مشن کے لئے آغازِ کار کیا۔

کرنل گریہم ان کی کامرانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

وہ (سرسید) ایک پیدائشی خطیب تھے۔ جب وہ مقصدِ پیشِ نظر کے سلسلے میں جوش و خروش سے بھرپور تقریر کرتے تھے تو ان کا اندازِ خطابت گلیڈسٹون سے مشابہ ہوتا تھا۔ اپنے اس جوش پر قابو رکھنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے تھے۔ آواز سوز ناک ہو جاتی تھی اور چہرہ متغیر ہو جاتا۔ درد و کرب کی یہ تمام کیفیتیں ان کے سامعین پر بجلی کا سا اثر کرتی تھیں۔

خطابت کی طرحِ نو

یہ درست ہے کہ سرسید سے قبل بنگالی مقررین نے تقریر میں بڑی شہرت پیدا کی تھی۔ لیکن ان کا یہ امتیاز انگریزی زبان کا پروردہ تھا۔ وہ اس میدان میں سرتاپا دیم پٹ۔ برکس اور فاکس جیسے انگریز مقررین کے مقلد تھے۔ لیکن سرسید پہلا شخص تھا جس نے اپنی ملکی زبان میں خطابت کا سکہ بٹھایا اور اس سلسلے میں ایک اچھوتا انداز اور نئی راہ پیدا کی۔ اُسے نہ تو انگریزی زبان پر عبور تھا کہ اس سے خطابت کے ترقی یافتہ اصول و انداز اخذ کر سکے اور نہ اس کے سامنے خطابت کا کوئی مثالی شاہکار تھا جس سے مستفید ہو سکے۔ اس کی اپنی زبان اُس وقت تک خطابت کی تمام خوبیوں سے محروم تھی۔ کیونکہ ملوکیت کے جس دور سے یہ ملک اور اس کی زبان گذرے تھے اس میں آزادیٔ تحریر و تقریر کا کوئی امکان ہی نہیں تھا خطابت کے کمالات صرف انہی فضاؤں میں نشوونما حاصل کرتے ہیں جہاں آزادیٔ مافی الضمیر کے کھلے مواقع حاصل ہوں۔ اور یہاں تو دورِ ملوکیت کا یہ عالم رہا کہ ہر تڑپتی ہوئی روح خاموشی سے یہ فریاد کر کے چپ ہو جاتی تھی کہ

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسی تیری محفل میں ۔۔۔ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

لیکن ان تمام بے نصیبیوں کے باوجود سرسید کی شخصیت جن گونا گوں کمالات کا امتزاج تھی۔ ان میں وہ کمالِ تحریر کے ساتھ ملکۂ تقریر میں بھی ایک امتیازی مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جوش اور فکر میں خلوص وارتقاء تھا۔ ان کے حافظہ میں بھی فطرتاً بڑی قوت موجود تھی۔ وہ واقعاتِ عالم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ واقعات سے نتائج کے استخراج کا ملکہ انھیں قدرتی طور پر حاصل تھا۔ زندگی سے متعلق تمام اہم امور اور مسائل میں ان کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ مذہب ہو یا معاشرت، سیاسیات ہوں یا معاشیات وہ سب پر ایک مستقل اور دوٹوک رائے رکھتے تھے چنانچہ ان تمام خصوصیات کا یہ نتیجہ تھا کہ تقریر کے سلسلے میں انھیں کبھی یادداشت کے طور پر تحریری نوٹس رکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھیں ایسی تحریر کے بجائے ہمیشہ اپنے ذہن پر بھروسہ ہوتا تھا۔ اور اپنے مذکورہ اوصاف کی موجودگی میں انھیں اپنی تقریر کے نکات ترتیب دینے اور انھیں ذہن میں محفوظ رکھنے میں ادنیٰ دقت نہیں ہوتی تھی۔ جب ذہن میں عالمانہ نکات کا یہ ہمہ گیر حسنِ ترتیب موجود رہے۔ زبان پر پوری قدرت حاصل ہو۔ دل ودماغ میں ایک صالح انقلاب کی تڑپ اور خلش بپا ہو اور سرسید جیسا وجاہت وجلال کا پیکر ان سامعین کے سامنے آئے جنھیں وہ ستاروں کی طرح سر بلند اور تابناک دیکھنے کے لئے بیتاب ہو تو پھر سوچئے کہ کہنے والے کی آواز میں کس قیامت کا تہلکہ ہوگا اور یہ بانگِ صورِ اسرافیل قومی بے حسی کے قبرستانوں میں کیا کیا حشر برپا کرتی ہوگی۔ جوش کے عالم میں ان کی آواز میں شیر کی سی گرج محسوس ہوتی تھی۔ اس میں قومی خلوص اور محبت کی نسیمِ جانفزا کے جھونکے بھی ہوتے تھے اور ہیجان واضطراب کی زلزلہ سامانیاں بھی۔ سرسید کا خطاب اقبال کے الفاظ میں بس یوں سمجھئے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

اور — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ان کی تقریروں میں وہ تقریریں بالخصوص خطابت کا شاہکار ہوتی تھیں جو وہ پبلک جلسوں میں اپنی رائے کے خلاف دوسروں کی تقریریں سننے کے بعد کرتے تھے۔ ان کا انداز اس قدر بیساختہ، والہانہ اور پُر جوش ہوتا تھا کہ ان کی دیگر عام تقریروں میں اس کی مثال نہیں ملتی ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو، سینیٹ کی مجلس ہو یا سنڈیکیٹ کا جلسہ جب بھی ان کی رائے یا پالیسی کے خلاف کوئی تقریر ہوتی تو جوابی تقریر کے دوران میں وہ وفورِ غضب سے آتش فشاں پہاڑ بن جاتے تھے۔ ان کی محشر خیز آواز سے ہال گونج اٹھتا تھا۔ اور فریقِ مخالف ان کی اس شانِ جلالی سے سہم کر رہ جاتا تھا۔ لیکن غیض وغضب کے اس پُرخروش عالم میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے تہذیب وشائستگی کی حدود سے تجاوز کیا ہو۔ مخالف ہوں یا موافق وہ سب سے زیادہ ان کے خلوص سے متاثر ہوتے تھے۔ اس خلوص کی دلکشی ان کے غیض وغضب میں بھی صاف جھلکتی نظر آتی تھی۔ اور ہر مخالفت اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ سرسید کی اس نوعیت کی بہت کم تقریریں محفوظ کی جاسکیں۔ صرف وہی چند تقریریں دوسروں تک پہنچ سکیں جو موقع پر قلمبند کرلی گئیں اور تہذیب الاخلاق یا کسی دیگر اخبار میں شائع ہوگئیں۔

سرسید کے لئے فرمائشی طور پر خطاب کرنا دردِ سر بن جاتا تھا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا اور انھیں احباب کی فرمائش پوری کرنے کے لئے تقریر کرنا ہوتی تو وہ بادلِ ناخواستہ ان کی دلجوئی کے زیرِ اثر کھڑے تو ہو جاتے لیکن ایسی تقریریں نہ ان کا مخصوص جوش وخروش موجود ہوتا

اور نہ ولولہ۔ لیکن جہاں صورتِ حال کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھیں فی البدیہہ کچھ کہنا ہوتا وہ بے حد قابلِ داد ہوتا۔ جون ۱۸۶۹ء میں جبکہ وہ انگلستان میں تھے "سمتھین سوسائٹی آف سول انجینئرز" نے جو انجینئروں کا ایک ممتاز ادارہ تھا ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا اس دعوت میں انگلستان کے بڑے بڑے لارڈز اور ڈیوک بھی شریک تھے اور چوٹی کے انجینئر بھی۔ اس تقریب میں تقریروں کا موضوع بھی انجینئرنگ تھا۔ سرسید نہ تو انگریزی میں تقریر کر سکتے تھے نہ انھیں انجینئرنگ سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ انھیں وہاں تقریر بھی کرنی ہوگی۔ لیکن جلسہ کے آخر میں صورت ایسی پیدا ہوگئی کہ ان کے لئے کچھ کہنا ضروری ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے ادنیٰ تیاری کے بغیر ایک ایسے فن پر جس سے وہ نا آشنائے محض تھے۔ ایک برجستہ تقریر اردو زبان میں کی۔ اور جب اس تقریر کا ترجمہ سنایا گیا تو بار بار پُرزور تالیوں سے اس کی داد دی گئی۔ اور "ڈیلی نیوز" نے اپنے کالموں میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "سرسید احمد خاں کی اسپیچ شاندار اور دلچسپ تھی"۔

سرسید کی خطابت کا ایک قابلِ ذکر شاہکار ان کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے ۱۸۸۴ء میں دورۂ پنجاب میں لاہور میں کی تھی۔ ہوا یوں کہ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ان کی منظوری اور اطلاع کے بغیر ہی اسلام کے موضوع پر ان کی تقریر کا اشتہار شائع کر دیا۔ سرسید کو اس کی اطلاع آخری وقت پر ملی۔ موضوع بڑا اہم تھا اور انھیں اس پر غور کرنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ لیکن یہی موقع تھا جس نے سرسید کے عظیم اور پیدائشی خطیب ہونے کی شہادت دی۔ "سفرنامہ پنجاب" میں ان کی یہ تقریر موجود ہے، اور اسے پڑھ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی معمولی وعظ نہیں تھا۔ انھیں ان شکوک و شبہات کی وضاحت کرنی تھی جو مذہبی عناصر نے ان کے خلاف عوام کے ذہنوں میں پیدا کر رکھے تھے۔ انھیں اسلام کی جہاں آرا عظمت کے ان نازک گوشوں کو منظرِ عام پر لانا تھا جن میں انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کا حل محفوظ ہے۔ انھیں اسلام کی یہ امتیازی حیثیت نکھار کر پیش کرنی تھی کہ خدا کے اس آخری دین نے وقت کے تقاضوں کو کس حسن انداز سے پورا کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ 'سفرنامہ پنجاب' کے مؤلف سید اقبال علی اس حقیقت افروز خطاب کے ضمن میں لکھتے ہیں

> مجھے سید صاحب سے ملنے، اور ان کی تقاریر سننے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے اس قدر موثر کلام ان کا اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

یہ تو مذہب کے معاملہ میں ان کے حسنِ خطابت کا ذکر تھا۔ اس سے بھی عجیب تر ان کا وہ پولیٹیکل لیکچر تھا جو انھوں نے لکھنؤ میں نیشنل کانگریس کے خلاف دیا تھا۔ اس کا خیال بھی ان کے دل میں صرف چند گھنٹے قبل آیا تھا۔ لیکن وہ اس قدر جامع، اس قدر مدلل، اور اس قدر زوردار تھا کہ اس کے بعد اس موضوع پر ہزاروں تقریریں ان کے مخالف اور موافق ہوئیں لیکن اس لیکچر کی مثال پیدا نہ ہو سکی۔

اس سے قبل بھی جب ۱۸۷۳ء میں سرسید پنجاب کے دورے پر لاہور آئے تو انھیں راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں کئی ہزار کے اجتماعِ عظیم سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ مولانا حالی ان دنوں لاہور ہی میں قیام پذیر تھے۔ چنانچہ وہ اس خطاب کی اثر انگیزیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے "حیاتِ جاوید" میں لکھتے ہیں۔

> یہ سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم طاری تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو

زار و قطار رو رہا ہو۔ اور جو اپنی بساط سے بڑھ کر چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہلِ پنجاب پر کیا تھا اس لیکچر نے دو تین گھنٹے میں اس کو دوچند کر دیا۔

اسی اہم تقریر میں ہی انھوں نے کہا تھا۔

بزرگانِ پنجاب! فرض کیجئے کہ میں بدعقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر معتمد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے۔ تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور خیرخواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کے دولت سرا جانتے ہیں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں یا آپ کے لئے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ چوہڑے چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت و مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔ کیا آپ مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا چاہتے ہیں..... براہِ خدا اپنی قوم اور اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کی فکر کیجئے۔

تقریر کا یہ اقتباس پیش کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں۔

یہی الفاظ جو آج معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں اس موقع پر جب سرسید کے منہ سے نکلے تھے تو ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں اور معنوں کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

سرسید کی بعض تقریریں ریکارڈ کر لی گئی تھیں اور وہ تہذیب الاخلاق اور سوسائٹی کے اخبار میں بالتفصیل شائع ہوتی رہیں۔ ان تقریروں سے سرسید کی خطابت کی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر ہم ان تقریروں کے اقتباسات پیش کرنے سے معذور ہیں ورنہ ہم انھیں پیش کر کے بتاتے کہ خطابت کے پلیٹ فارم پر سرسید کا مقام کس قدر بلند تھا۔

ایک عظیم پارلیمنٹیرین

سرسید کی اثر آفریں تقریروں کے علاوہ جو انھوں نے ملک کے مختلف حصّوں اور بالخصوص پنجاب کے شہروں میں کیں ہمارے سامنے ان کی وہ اسپیچیں آتی ہیں جو انھوں نے وائسرائے ہند کی لیجسلیٹو کونسل کے معزز رکن کی حیثیت سے کونسل مذکور میں کیں۔ واضح ہے کہ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے انھیں پہلی بار اپنی مجلس قانون ساز کا رکن مقرر کیا تھا اور ان کے بعد لارڈ رپن نے دوسری بار انھیں اس کونسل کا رکن منتخب کر کے ان کی پارلیمنٹری خوبیوں کے منظر عام پر آنے کا موقع پیدا کیا۔ یہ سرسید ہی تھے جنھوں نے اسباب بغاوت ہند کی تفصیل میں بغاوت ہند کا سب سے بڑا سبب یہی بتایا تھا وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ چنانچہ حکومت اپنی اس فروگذاشت کے مخلصانہ اعتراف پر مجبور ہوگئی اور اس نے یہ مناسب سمجھا کہ ہندوستانیوں کو بھی ملک کی اس عظیم ترین قانونی مجلس میں شریک کار بنایا جائے۔ اس طرح انھوں نے اپنے ملک کی قابل ترین شخصیتوں کو سرکاری اقتدار اور

پارلیمنٹری امور میں نمائندگی دلانے کا جو مطالبہ کیا تھا جب اس کی عملی تشکیل کا مرحلہ آیا تو اس امتیاز کا قرعۂ فال بھی سر سید ہی کے نام پڑا اور جب وہ لیجسلیٹو کونسل کے رکن چن لئے گئے تو "بمبئی گزٹ" نے یہ ریمارک کیا کہ

> "حکومت ان نقائص کی تلافی کے لئے جو سر سید نے اسباب بغاوت میں ظاہر کئے تھے غافل نہیں تھی۔ خود انھیں (سر سید کو) لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کا ممبری کے لئے منتخب اور نامزد کرنا اس بات کی عمدہ ضمانت ہے کہ حکومت اپنی رعایا کے ایک معزز طبقہ کے مطالبات اور مقاصد سے آگاہ ہو۔"

واضح رہے کہ اس گرانمایہ اعزاز کو حاصل کرنے کے بعد سر سید خاموش نہیں رہے۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کے ایک ممتاز نمائندے کی حیثیت سے سر سید کو یہ دعوت دی گئی کہ وہ آگے بڑھیں اور نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے ملک کو اس منصب کا اہل ثابت کریں جس کا مطالبہ انھوں نے برطانوی حکومت سے کیا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ ہندوستانیوں کی غیرت اور پارلیمنٹری صلاحیتوں کو ایک چیلنج تھا جسے اس مرد میدان نے مردانہ وار قبول کیا۔ اگرچہ سر سید کے لئے اس میدان میں آنے کا یہ پہلا موقع تھا اور ملک کی جمہوری روایات ایسے تجربات سے محروم چلی آرہی تھیں لیکن سر سید کی جامع الصفات شخصیت نے اس عظیم ذمہ داری کو جس جرأت اور قابلیت سے پورا کیا وہ ان کی شخصی عظمت کی قابلِ قدر شہادت ہے۔

قانون سازی کا ریکارڈ

انھوں نے سب سے پہلے کونسل میں چیچک کے ٹیکہ کا مسودہ قانون پیش کیا۔ اس کی ضرورت پر ایک عالمانہ تقریر کی۔ اس کے باوجود کہ پنجاب کے اُس وقت کے لفٹیننٹ گورنر نے اس مسودہ قانون کی شدید مخالفت کی، کونسل کے ارکان نے ان کا ساتھ دیا اور ایک آدھ برائے نام جزوی ترمیم کے بعد اسے ملکی قانون کی حیثیت دے دی گئی۔

سر سید کا دوسرا مسودہ "قانون تقرر قاضیان" تھا۔ اس مسودہ کو پاس کرانے کا منشاء یہ تھا کہ عہدۂ قضا کو مسلمان حکومتوں میں جو سرکاری حیثیت حاصل تھی اُسے از سر نو پھر بحال کیا جائے۔ یعنی مسلمانوں کے شرعی معاملات میں قاضیوں کو ایک مجسٹریٹ اور جج کے سے اختیارات قانوناً حاصل ہوں۔ سر سید نے اس مسودۂ قانون کی تحریک کرتے ہوئے پوری قابلیت سے اس کی ضرورت کو واضح کیا۔ ان کے علاوہ اس نے کئی اور اہم قانونی مسودات بھی پیش کئے۔

سر سید نے کونسل میں ملکی و قومی مفاد کے مسودہ ہائے قوانین پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دوسروں کے پیش کردہ مسودات اور دیگر تحریکوں پر ایسی جامع اور فاضلانہ تقریریں کیں جن سے ان کے ایک عظیم القدر پارلیمنٹیرین ہونے کا سکہ سب پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اس نمائندگی میں وہ جن مشکلات سے دوچار ہوتے تھے وہ کسی دوسرے رکن کو درپیش نہیں تھیں یعنی کونسل کے ضابطہ کے مطابق انھیں انگریزی میں تقریر کرنی ہوتی اور وہ اس پر عبور نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ پہلے وہ اپنی تقریر کے اردو مسودوں کا انگریزی میں ترجمہ کراتے اور پھر انگریزی حروف کو فارسی رسم الخط میں لکھ کر کونسل میں خطاب کرتے تھے۔ ان تمام رکاوٹوں اور مجبوریوں کے باوجود ان کی ہر تقریر پارلیمنٹری نقطۂ نظر سے بڑی اہم اور قابلِ تحسین قرار پاتی تھی۔ اور اربابِ حکومت کو اس قابلیت پر حیرت ہوتی تھی۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ دلکش ہے

ہ۔ لارڈ لٹن کے متعلق سرسید نے خود بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

جب اجلاس ختم ہونے کے بعد میں کونسل ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے اور بڑی مروت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ تقریر کبھی نہیں سنی۔

سرسید کی یہ تقریر مسودہ قانون مزارعین دکن پر تھی۔ اور کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں اسے شائع کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے مسودۂ قانون انتقالِ جائیداد، قانونِ حقوقِ استفادہ، قانون ترمیم مجموعہ ضابطہ فوجداری اور قانون لوکل سیلف گورنمنٹ پر بھی ایسی فاضلانہ تقریریں کیں جو اس ملک کی پارلیمنٹری تاریخ میں ایک ممتاز اور مخصوص مقام رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کم و بیش ایسی اٹھارہ قراردادوں کی کونسل میں تحریک کی جو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور فلاح و بہبود کی پُرجوش امنگوں پر مبنی تھیں۔

لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت اس دور میں ایک قابلِ فخر اور گرانمایہ اعزاز تھا لیکن جب سرسید نے دیکھا کہ کلکتہ پہنچکر کونسل کے اجلاس میں شریک ہونے سے دارالعلوم کی کوششوں پر اثر پڑتا ہے تو انھوں نے اس اعزاز کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور کونسل سے مستعفی ہو گئے لیکن جو جگہ ان سے خالی ہوئی وہ پُر نہ ہو سکی اور جب نئے سرے سے کونسل کی تشکیل کی گئی تو وہ پھر اس میں شامل کئے گئے۔

تعلیمی کمیشن میں

اسی طرح حکومت کی طرف سے انھیں تعلیمی کمیشن کی رکنیت کا اعزاز بھی پیش کیا گیا اور انھوں نے کچھ مدت اس میں کام بھی کیا لیکن جبکہ ضابطۂ کار کے بعض امور سے انھیں اختلاف ہوا اور ان کی تجاویز اس سلسلے میں نظر انداز کر دی گئیں تو وہ کمیشن سے بھی مستعفی ہو گئے اور ان کی خالی جگہ ان کے فرزند سید محمود سے پُر کی گئی۔ اس کمیشن میں ان کی شہادت ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے نظام تعلیم کے متعلق انھوں نے جو جوابات کمیشن کو دیئے ان کا اندراج یہاں ممکن نہیں لیکن ان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی وہ کس قدر امتیازی درجہ رکھتے تھے۔

البرٹ بل پر معرکہ آرا تقریر

یہ بل ۱۸۸۳ء میں لیجسلیٹو کونسل میں کونسل کے لیگل ممبر (رکن قانونی) مسٹر البرٹ نے پیش کیا تھا اور اس کا مفہوم ہندوستانی مجسٹریٹوں کو یورپین مجسٹریٹوں کی طرح یہ اختیار عطا کرنا تھا کہ وہ بھی یورپین باشندوں کے خلاف فوجداری مقدمات کے فیصلے دے سکیں۔ یورپین حلقوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور جب سرسید اسکی تائید میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیان اور دلائل و براہین سے اجلاس میں ایک سماں باندھ دیا۔ ان کی یہ اہم تقریر ریکارڈ میں محفوظ چلی آ رہی ہے اور اسے بجا طور پر پارلیمنٹری خطابت کا ایک قابلِ تحسین اور لازوال شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے میں ان کا یہ موقف رقصاں کرتا نظر آرہا ہے کہ انسانی مساوات کی سطح پر حکمران قوم کو قانوناً کوئی فوقیت حاصل نہیں اور قانون کی نگاہوں میں انھیں ہندوستانیوں سے ممتاز قرار دینا نہ صرف ہندوستان کی توہین ہے بلکہ یہ شرف انسانیت پر بھی ایک بدنما داغ ہے۔

مجلس قانون ساز میں سرسید کے کارنامے نہ صرف ان کے ممتاز پارلیمنٹرین ہونے کی شہادت دے رہے ہیں بلکہ وہ مسلمانوں سے زیادہ برادرانِ وطن سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ چنانچہ انڈین ایسوسی ایشن نے ۱۸۸۴ء میں لاہور میں ان کو جو سپاسنامہ پیش کیا اس میں ان کارناموں کی دل کھول کر داد دی گئی۔ اسی طرح جیسا کہ سفرنامہ پنجاب سے پایا جاتا ہے لاہور میں برہمو سماج اور آریہ سماج کے جو وفود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے بھی سرسید کی عظیم خدمات پر تہنیت و تشکر کے جذبات کا اظہار کیا۔

کونسی کتاب؟

اسلامی ـــــ ثقافتی ـــــ تاریخی
علمی ـــــ ادبی ـــــ معلوماتی

جس انداز کی کتاب آپ کو پسند ہو اُس کا آرڈر ہمیں دیجئے۔ کتاب آپ کو روانہ کردی جائے گی۔

ـــــ ان میں سے دیکھئے ـــــ

المرشد الامین
امام غزالیؒ کے قلم سے تصوف پر ایک نادر کتاب ہے۔ ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی نے کیا ہے۔ صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ صفحات ۵۴۴ ۔ قیمت ۶/۸

توہین
کیا انسان کبھی توہین برداشت کر سکتا ہے؟ نہیں۔ لیکن عارف بٹالوی کے الفاظ میں "ہاں"! وہ کیسے؟ اس کا جواب عارف بٹالوی کے تازہ ناول "توہین" کے مطالعہ سے ملے گا۔ صفحات ۳۸۴۔ گردپوش قابل دید۔ قیمت -/۵ روپے

حادثہ
زندگی میں قدم قدم پر حادثات رونما ہوتے ہیں۔ کوئی اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے اور کوئی گرا کر عمیق گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے۔ اب دیکھئے قیسی رامپوری کا ناول حادثہ کسے کہاں پہنچاتا ہے۔ صفحات ۳۸۴۔ گردپوش دیدہ زیب قیمت ۵/۸

تاریخ اسلام
رئیس احمد جعفری جیسے ہمہ گیر صاحب قلم کی کاوش کا نتیجہ۔ اسلام کی تاریخ شگفتہ اور دلچسپ انداز میں
صفحات ۵۴۴ قیمت ۶/۸ مجلد

فرصت کے دن
انسان کو زندگی میں فرصت کے دن بہت ہی کم ملتے ہیں۔ فرصت کے وقت بھی انسان مشغول رہتا ہے۔ اس بات کو قیسی رامپوری نے اپنے اس ناول میں بڑی خوبی سے قلمبند کیا ہے۔ ضخامت ۳۳۶ قیمت -/۵

عمر فاروق اعظمؓ
محمد حسین ہیکل کی تصنیف اور حبیب اشعر کا ترجمہ
ضخامت ۷۶۵ قیمت /۲۰

آن
بعض اوقات انسان بغیر کسی قربانی کے بھی اپنی آن بچا لیتا ہے۔ کیسے؟ اس کا جواب رئیس احمد جعفری کا ناول "آن" پڑھ کر دیجئے۔
ضخامت ۳۲۰ قیمت ۴/۱۲ مجلد

ملنے کا پتہ: ـــــ مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور